قیمت چار آنہ
سالانہ دس روپے

کراچی: ہفتہ ۱۶ اپریل ۱۹۵۵ء

جلد ۸
شمارہ ۱۱

قرآن نے کیا کہا؟

یہ چاند ۔ یہ سورج ۔ یہ ستارے کس نے بنائے ہیں؟ خدا نے ۔ لیکن اتنا ماننے سے تم صاحب ایمان نہیں ہو سکتے ۔ ولئن سألتهم من خلق السموت والارض وسخر الشمس والقمر لیقولن اللہ ۔ اگر ان سے پوچھو کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو کس نے پیدا کیا اور چاند اور سورج کس کے قانون کی زنجیروں سے بندھے ہوئے ہیں تو یہ اقرار کرینگے کہ اللہ ہی نے ایسا کر رکھا ہے ۔ ان سے پوچھو کہ پھر تم اپنے معاشرے کی تشکیل کے وقت اُس کے قانون کو سامنے کیوں نہیں لاتے؟ یہاں پہنچ کر تم کسی اور طرف کیوں چل نکلتے ہو؟ یاد رکھو ۔ اللہ یبسط الرزق لمن یشاء من عبادہ و یقدر لہ ۔ رزق کی تنگی اور کشادگی کے لئے بھی خدا کی طرف سے ایک قانون مقرر ہے ۔ لہذہ جو قوم چاہتی ہے کہ اسے رزق فراواں ملے اسے چاہئے کہ اُس قانون کے مطابق اپنا معاشی نظام قائم کرے اور جو چاہتی ہے کہ اس کی معشیت تنگ ہو جائے وہ اس نظام کو چھوڑ دے ۔ ان اللہ بکل شئی علیم (۲۹/۶۱-۶۲) اللہ کا قانون ہر بات کا علم رکھتا ہے ۔ یہاں ہر فیصلہ علم و حکمت کے مطابق ہوتا ہے ۔ یونہی دھاندلی سے کچھ نہیں ہوتا ۔

طلوع اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ ....

1. تنہا انسانی عقل زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کیلئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔
2. یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اس لئے نوع انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔
3. حق اور باطل کا معیار قرآن ہے۔ جو روایات قرآن کے مطابق ہیں صحیح ہیں جو اس کے خلاف ہیں غلط ہیں۔
4. حضور نبی اکرمؐ انسانی سیرت و کردار کے بلندترین مقام پر فائز تھے لیکن بعض سازشوں نے ہماری تاریخ میں ایسی چیزیں شامل کر رکھی ہیں جن سے حضورؐ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ ہماری تاریخ کے ایسے تمام حصے (خواہ وہ کسی کتاب میں ہوں) یکسر غلط اور وضعی ہیں۔ حضورؐ کی سیرت کا صحیح معیار خود قرآن کریم ہے۔
5. قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس برادری کے قیام کی عملی شکل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔
6. اس عالمگیر نظام زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں (انہیں قانون شریعت کہا جاتا ہے)۔ یہ جزئی قوانین حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔
7. اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جاتی ہے اور کوئی فرد معاشرہ اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ اسے ربوبیت عامہ یعنی تمام نوع انسانی کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
8. ربوبیت عامہ کے مقصد عظیم کے حصول کے لئے قرآن کی رو سے ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے انفرادی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔ اسے "قرآنی نظام ربوبیت" کہا جاتا ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ ....

ابتداءً پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں یہ قرآنی نظام ربوبیت نافذ ہو جائے تاکہ صفات خداوندی کی روشنی میں ہر انسان کی دبی ہوئی صلاحیتیں کامل نشوونما پا سکیں اور اس طرح "زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے"۔

اگر آپ طلوع اسلام کے اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوع اسلام کا ساتھ دیجئے

اس شمارے میں

★ پاکستان کی فارن پالیسی
★ ایشیائی افریقی کانفرنس
★ مجرمانہ خاموشی
★ تاریخی شواہد
★ اسلام کی سرگزشت
★ اوروں کے مسائل
★ عورت کا قرآن
★ مجلس اقبال
★ مشرقی پاکستان کے کمیونسٹ
★ حدیث اور سنت کی حیثیت
★ نقد و نظر
★ باب المراسلات
★ حقائق و عبر

قرانی فکر کی نشر و اشاعت

آپ اس میں کس طرح حصہ لے سکتے ہیں

طلوع اسلام قرانی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اسکا لٹریچر جسقدر زیادہ شائع ہوگا اسی قدر قرانی فکر عام ہوگی اور اسی نسبت سے قرانی انقلاب قریب سے قریب تر آتا جائیگا۔ اس کے لئے طلوع اسلام نے "پیشگی خریداران" کی اسکیم جاری کی ہے۔ یعنی اگر آپ ایک سو روپیہ پیشگی ادا کردیں (یک مشت یا پچیس روپے کی ماہانہ اقساط میں) تو آپ کا حساب کھول لیا جائیگا اور اس میں سے آپ کو طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں بلا محصول ڈاک گھر بیٹھے ملتی جائینگی تآنکہ آپ کی پیشگی رقم پوری نہ ہوجائے۔ اس طرح ــ ــ ــ

- آپ کی پیشگی رقم سے ہمیں مزید کتابیں شائع کرنے میں سہولت مل جائیگی۔ اور
- آپ کو طلوع اسلام کی کتابیں بلا محصول ڈاک خود بخود ملتی چلی جائینگی۔ اگر آپ اس وقت تک اس اسکیم میں شامل نہیں ہوئے تو اب شامل ہوجائیے۔

معاملہ کی ضروری باتیں

- طلوع اسلام آپ کا اپنا ادارہ ہے اس لئے اس سے اسی طرح کا برتاؤ کیجئے جس طرح اپنوں سے برتاؤ کیا جاتا ہے۔ یہ بھی آپ سے ایسا ہی برتاؤ کریگا۔
- حساب میں بعض اوقات غلطی ہوسکتی ہے۔ ایسی غلطی باہمی افہام و تفہیم سے صاف کرلیجیے۔
- رسالہ کے انتظامی معاملات کے متعلق الگ خط لکھئے۔ کتابوں کے لئے الگ۔
- مضامین کے متعلق مدیر کے نام علحدہ خط لکھئے۔ نیز استفسارات مدیر کے نام الگ بھیجئے۔
- پتہ کی تبدیلی سے کم از کم دو ہفتہ پہلے اطلاع دیجئے۔
- پرچہ نہ ملنے کی اطلاع تاریخ اشاعت کے ایک ہفتہ کے اندر دیجئے۔ بعد میں رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳۔ کراچی۔ ۳

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار

طلوعِ اسلام

جلد ۸ — ۱۶ر اپریل ۱۹۵۵ء — نمبر ۱۱

پاکستان کی فارن پالیسی

بین الاقوامی سیاست کے طالب علم بخوبی جانتے ہیں کہ آجکل کوئی قوم تنہا نہیں رہ سکتی۔ یہ صورت چھوٹے ملکوں کے لئے ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے ممالک کے لئے بھی ہے۔ اور تو اور امریکہ اور روس بھی جو دنیا کی عظیم ترین سلطنتیں ہیں چھوٹی سلطنتوں کو معاہدہ و حلیف بنانے میں کوشاں رہتی ہیں۔ بین الاقوامی سیاست کے طالب علم یہ بھی جانتے ہیں کہ آزاد قومیں اپنے ملکی مفاد کے مطابق ایک فارن پالیسی متعین کرتی ہیں اور پھر اس کے مطابق وہ ہمسایہ یا ہم خیال قوموں سے اشتراک تعاون کرتی ہیں۔ اس وقت اس کرۂ ارض پر متعدد ایسی تنظیمیں وجود میں آچکی ہیں یا ان کی تشکیل کے لئے سعی و کاوش کی جارہی ہے۔ مثلاً امریکہ کو دیکھئے۔ اس نے برطانیہ، فرانس، اٹلی وغیرہ اقوام مغربی یورپ سے معاہدے کر رکھے ہیں وہ ان کے تانے بانے دن بدن مضبوط کرتا جارہا ہے اور متفرق علاقائی دفاعی تنظیموں کی تشکیل میں مصروف رہتا ہے۔ اس کی نگاہ اپنے حریف "روس" پر ہے اور وہ اس کے لئے ہر اس چھوٹی یا بڑی سلطنت سے معاہدہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے جو اشتراکیت کی روک تھام کے لئے آمادہ ہو۔ یہ علاقائی تنظیمیں موجودہ بین الاقوامی سیاست کی اصل الاصول ہیں اور اقوامِ متحدہ تک نے انہیں جائز متصور کر رکھا ہے۔

اس تمہید کے بعد، آیئے ذرا جائزہ لیں کہ پاکستان نے گذشتہ آٹھ سال میں بین الاقوامی میدان میں کیا کیا اور کیا نہیں کیا اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ اس کا جواب دینے کے لئے ہمیں تقسیم سے پہلے کی مسلم سیاست پر بھی ایک طائرانہ نگاہ ڈالنی ہوگی۔ تقسیم سے پہلے ہوتا یہ تھا کہ جب کبھی ہندوستان کے اندر یا بیرونی ممالک میں کوئی ایسا حادثہ ہوتا جس سے مسلمان متاثر ہوتے تو وہ جلسے کر لیا کرتے، مسجدوں میں دعائیں مانگتے، بیانات دیا کرتے اور کبھی کبھی (مثلاً بلقان، طرابلس، خلافت وغیرہ کے بارے میں) چندے جمع کر لیا کرتے۔ یہ الفاظ یا چندے متعلقہ مقامات تک پہنچتے یا نہ پہنچتے مسلمانوں کے دل کا بخار ضرور ہلکا ہو جاتا۔ اس سے زیادہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ انگریز اور ہندو دونوں میں گھرے ہوئے تھے۔ اگر انگریز کے قوانین ان کے راستے میں حائل تھے تو ہندو نشر و اشاعت کے جملہ ذرائع و وسائل پر قابض تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا بے پناہ قلبی اضطراب عملی سیاست کو چنداں متاثر نہیں کر سکا۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں اور اس کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں نے جو تحریک ترکوں کی حمایت میں اٹھائی اس کی عظمت اور گہرائی سے سیاست کا کوئی طالب علم انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کا فائدہ ترکی کو کیا پہنچا؟ اس کا جواب کمال پاشا کے اس جواب میں ملے گا جو انہوں نے ان خلافتی رہنماؤں کو دیا جنہوں نے مسلمانوں کے شدت کرب کا نقشہ ان کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ صحیح ہے کہ آپ کے دنوں کی تپش اور شبوں کا گداز ترک بھائیوں کے لئے وقف رہا لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ترکوں کے خلاف میدان جنگ میں لڑنے والے سپاہی بھی آپ ہی کے ملک کے مسلمان تھے۔ یہ تصویر کا ایک رخ ضرور ہے لیکن یہ آئینہ ہے اس حقیقت کا کہ اپنی بساط کے مطابق یا اس سے بڑھ کر سب کچھ کرنے اور خود مبتلائے رنج و محن ہونے کے باوجود مسلمان ان برادرانِ دین و ملت کو کوئی حقیقی فائدہ نہیں پہنچا سکے جن کے لئے انہوں نے اپنی زندگی اجیرن کر لی تھی۔ یہ اس لئے تھا کہ اُس زمانے میں مسلمان اپنی (داخلی یا خارجی) پالیسی آپ متعین نہیں کر سکتا تھا۔

دورِ غلامی میں یہ کچھ تو قابلِ فہم تھا لیکن پاکستان میں آزادی کے بعد جو کچھ ہوا وہ اس سے چنداں مختلف نہ تھا۔ آزادی سے نام اور مقام تو بدل گئے لیکن کہانی وہی رہی، اس کا تانا بانا بھی وہی رہا اور اس کا انجام بھی وہی ہوا۔ یہ حیران کن ضرور ہے کہ ہم آزاد تو ہوگئے لیکن آزادی نے ہمارے قلب و ذہن میں کوئی قابلِ ذکر تبدیلی پیدا نہیں کی۔ ہمارے اندر یہ تبدیلی پیدا کیوں نہیں ہو سکی یہ ایک الگ بحث ہے اور پیشِ نظر موضوع سے خارج۔ بہرحال ہوا یہی کہ جیسے بین الملی حوادث میں مسلمان جس طرح پہلے انفرادی طور پر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیا کرتے تھے، آزادی کے بعد بھی وہ ایسے ہی کرنے لگے اور کرتے رہے۔ اور حد تو یہ ہے کہ خود اربابِ حکومت کی طرف سے ایسا ہی مظاہرہ ہوتا رہا۔ مثلاً جب کوئی ایسا مسئلہ سامنے آیا جس کی زد کسی اسلامی ملک پر پڑتی تھی تو ہمارے نمائندوں کی طرف سے اقوامِ متحدہ میں پیرس اس پر تقریریں کی گئیں جن میں آزادی، حق و انصاف، اقدارِ انسانیہ پر درس دیئے جاتے تھے۔ (ایسی تقریریں تقسیم سے پہلے اپنے ہاں کے پبلک جلسوں میں ہوا کرتی تھیں) ہمارے وزراء اور نمائندوں نے جو تقریریں اقوام متحدہ وغیرہ میں کیں ان کو جمع کیا جائے تو دفتروں کے دفتر تیار ہو سکتے ہیں۔ بیرونِ ملک تو یہ ہوا اور اندرونِ ملک کبھی موتمر اسلامی منعقد کی گئی، کبھی احتفال العلماء کا اہتمام کیا گیا۔ کبھی اسلامی اقتصادی کانفرنس کا ڈھونگ رچایا گیا اور کبھی مسلم نوجوانوں کی اسمبلی کا سوانگ بھر آیا۔ یہ سب کچھ کم و بیش انفرادی طور پر ہوا۔ لیکن اگر واقعی یہ تماشے انفرادی طور پر ہوتے تو شاید ان سے اس قدر نقصان نہ پہنچتا۔ لیکن ہوا یہ کہ حکومت نے ان "تقریبات" کو "کامیاب" بنانے میں مدد بھی کی۔ مگر ذمہ دارانہ طور پر کبھی سامنے نہیں آئی۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ایک آزاد ملک کی حکومت کے لئے اس طرح زاہدانہ طور پر بزمِ شراب میں آنے کی کیا وجہ جواز ہو سکتی تھی؟ لیکن ہمارے پالیسی بنانے والوں نے صورتِ حال کو سمجھنے کی ذرہ بھر کوشش نہیں کی۔ اس کا دوہرا نقصان ہوا۔ اندرونِ ملک 'عام مسلمان' جو اس سے پہلے انتہائی خلوص سے مسلمانانِ عالم کے مصائب کو دور کرنے کے خیال سے ہر طرح ایثار کے لئے تیار ہو جایا کرتے تھے، وہ ان تقریبات کو سرکاری سمجھ کر بد دل ہوتے گئے، اور ان کی وابستگی محض تماشائیوں کی سی رہ گئی۔ اور بیرونِ ملک مخالفینِ پاکستان نے یہ پروپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا کہ پاکستان قیادتِ عالم اسلامی کے خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ کچھ ہوتا رہا اور کسی اللہ کے بندے کو یہ توفیق نصیب نہ ہوئی کہ وہ سوچتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور اس کا مداوا کیا ہے؟

اب دیکھئے کہ اس "پالیسی" کا نتیجہ کیا نکلا؟ ہمارا تعلق مسلمانانِ عالمِ اسلامی سے بڑا گہرا رہا ہے۔ یہاں تک کہ کرۂ ارض پر کہیں کسی مسلمان کے تلوے میں کانٹا بھی چبھ گیا تو ہمارے آنکھ کے آبگینے میں آنسو چھلک آئے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد اس ردِ عمل میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی اور ہم بدستور یہ سمجھتے رہے کہ ہمارے اور مسلمانانِ عالم کے مابین اخوت و مودت کے گہرے روابط ہیں۔ ان روابط میں شبہ تو کوئی نہیں تھا لیکن آزاد مملکت کی حیثیت سے ان کو عملی شکل دینے کا جو موقع ہمیں ملا اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ اور تو اور جن مسلم ممالک کی ہم ہر مقدمہ میں وکالت کرتے رہے اور جن کی تائید و حمایت میں بڑھ چڑھ کر تقریریں کرتے رہے انہوں نے ہمیں کبھی نہ کہا کہ "آپ کا شکریہ!" اس احساس کے باوجود کہ ہم

ان کے مطالبات قومی کے مؤید رہے ہیں، انہوں نے کسی مسئلہ میں ہماری تائید نہیں کی۔ تائید کو تو چھوڑیئے، یہ ممالک الٹے ہمارے مخالف ہوتے گئے۔ چنانچہ آج مصر ہمارا ہمنوا نہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کی پالیسی ہندوستان کی پالیسی کے مطابق ہے۔ اس کا وزیر اعظم صاف طور پر کہہ رہا ہے کہ وہ اور پنڈت نہرو ایک طرح سوچتے ہیں اور ان کی اور ہندوستان کی پالیسی یکساں ہے۔ سعودی عرب بھی مصر ہی کی راہ پر گامزن ہے۔ اس کے والی، شاہ سعود، پاکستان تشریف لائے تو انہوں نے کہا تھا کہ وہ پاکستان کو اپنا وطن سمجھتے ہیں۔ اس کے باوصف وہ مصری موقف پر قائم ہیں۔ افغانستان ہمارا کھلا دشمن ہے۔ انڈونیشیا بھی ہندوستان کی غیر جانبدارانہ پالیسی کا مؤید ہے۔ ایران نے ہماری مہمان نوازیوں کے باوجود، اقوام متحدہ کی صدارت کے سلسلہ میں ہمارے مقابلہ میں اپنا امیدوار کھڑا کر دیا تھا۔

یہ ہے پاکستان کی حالت دنیائے اسلام میں۔ اس قریبی دائرہ سے باہر بھی پاکستان کا جو حال ہے، وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ پہلے برطانیہ کو لیجئے کہ جس کی دولت مشترکہ میں وہ شامل ہے (اور آزاد جمہوریہ ہونے کے بعد بھی غالباً شامل رہے گا)۔ دولت مشترکہ کو ایک خاندان بتایا جاتا ہے لیکن اس خاندان کی صورت یہ ہے کہ اس کے افراد، پاکستان اور ہندوستان، ایک دوسرے سے کشمیر میں لڑتے رہے لیکن وہ اس جنگ کو بند نہیں کرا سکا۔ جنگ کے بعد اس خاندان نے کشمیر کے تصفیہ کے حل میں کسی قسم کی مدد نہیں دی۔ حل میں مدد دینا تو ایک طرف اس نے پاکستانی موقف کی حمایت تک نہیں کی۔ وزرائے اعظم کی تازہ کانفرنس میں جو اس سال جنوری میں منعقد ہوئی، ہمارے وزیر اعظم نے کشمیر کو خاندان دولت مشترکہ کا مسئلہ قرار دیا لیکن کسی کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی اور اس سے متعلق کچھ بات نہ ہو سکی۔ کشمیر کے مسئلہ کے علاوہ دیگر مسائل میں بھی برطانیہ، پاکستانی مطالبات کو کم سے کم خاطر میں لایا۔ لیکن اس کے برعکس ہندوستان کی خوشنودی علانیہ کرتا رہا۔ قائد اعظم نے اپنی حین حیات میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ دولت مشترکہ ضمانت دے کہ پاکستانی سرحدات محفوظ رہیں گی لیکن اس تجویز کو شائستہ اعتناء سمجھا گیا۔ مرحوم لیاقت علی خاں نے کھلم کھلا شکایت کی تھی کہ برطانیہ نے فرض کر لیا ہے کہ پاکستان مٹی کا مادھو ہے اور وہ ہر وقت اس کی ہاں میں ہاں ملائے گا۔ دولت مشترکہ میں شریک رہنے سے پاکستان کو کیا فائدہ پہنچا ہے اور کیا نقصان، یہ علیحدہ مبحث ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کے نزدیک جو مسائل زندگی اور موت کے مترادف تھے ان کے حل میں اس کی رکنیت نے کوئی مدد نہیں دی۔ ایک برطانیہ ہی کیا کسی رکن دولت مشترکہ نے ہمارے مطالبات سے ہمدردی کا اظہار نہیں کیا۔

اس حلقہ سے آگے بڑھئے تو روس اور امریکہ کی باری آتی ہے۔ ہم نے روس سے ہٹ کر امریکہ سے دوستی کی طرح ڈالی اس سے فوجی مدد تک لے لی اور اس کی وجہ سے دنیا میں بدنام بھی ہوئے لیکن اس سے ہم امریکہ کو اپنا دوست ان معنوں میں نہیں بنا سکے کہ وہ بین الاقوامی مسائل میں ہمارے حق میں ووٹ دے۔ مثلاً کشمیر کے بارے میں ہمیں اس کی دوستانہ مدد حاصل نہیں ہو سکی اور ہم بین الاقوامی میدان میں تنہا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کشمیر کو اقوام متحدہ میں لیجانے سے جھجکتے ہیں اور ہندوستان کی جا و بیجا خوشامد کرتے رہتے ہیں کہ وہ مذاکرات باہمی سے اس کے حل پر آمادہ ہو جائے۔ پانی کے مسئلہ میں بھی امریکہ نے جو کچھ ہماری مدد کی ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔

سطور بالا سے یہ تشویشناک صورت سامنے آتی ہے کہ پاکستان کی عالم اسلامی میں کوئی ساکھ نہیں۔ برطانیہ اس کا دوست نہیں۔ امریکہ اس کے حق میں کھلم کھلا ووٹ دینے کے لئے تیار نہیں۔ گویا وہ دنیائے سیاست میں بالکل تنہا اور بے یار و مددگار ہے اس کی یہ تنہائی ایسے عالم میں ہے کہ روس اور امریکہ جیسے ممالک بھی تنہا رہنے کا تصور نہیں کر سکتے۔ تصور کرنا تو ایک طرف، وہ چھوٹی چھوٹی اقوام کو بھی اپنے ساتھ ملانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ کوئی اور ملک اس قدر تنہا ہوتا تو شاید وہ اپنے حواس کھو بیٹھتا کیونکہ اس سے اس کی بقا معرض خطر میں پڑ جاتی لیکن ہمارے ارباب حکومت مگن ہیں کہ جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ یہ تنہائی دوسری قوموں سے ہٹ کر اور علیحدہ رہنے کی بدولت نہیں۔ پاکستان قریباً وہ سب کچھ کرتا رہا ہے جس سے اسے دیگر اقوام کی حمایت اور دوستی میسر آئے لیکن اس کے باوصف نتیجہ وہ نکلا جو اب ہمارے سامنے ہے۔

اس اضطراب انگیز صورت حالات کی علت پاکستان کی بےعملی میں نہیں بلکہ اس کی بے مقصدی میں تلاش کرنی چاہئے جیسا کہ شروع میں لکھا گیا ہے ارباب پاکستان نے آزادی کے بعد بھی اپنی سعی و عمل کا انداز وہی رکھا جو غلامی کے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔ جب کوئی بات سامنے آئی اس پر تقریر کر دی، بیان دے دیا، قرارداد پاس کر دی، اور بس۔ کسی نے یہ نہ سوچا کہ اب وہ آزاد حکومت کی حیثیت رکھتے ہیں اور آزاد حکومتیں محض تقریریں نہیں کیا کرتیں۔ کسی نے اس کا اندازہ نہیں لگایا کہ بحیثیت آزاد حکومت وہ کس قدر مؤثر ہو سکتے ہیں۔ بالخصوص جبکہ انہیں ایک ایسی پوزیشن حاصل ہے کہ وہ بین الاقوامی سیاست کا توازن بگاڑنے اور بنانے میں بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اس حیثیت سے پہلے دن ہمیں یہ طے کر لینا چاہیئے تھا کہ بین الاقوامی سیاست میں ہمارا کردار کیا ہوگا۔ یعنی ہماری فارن پالیسی کیا ہوگی۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا اور ہوتا بھی کیسے؟ اس کے لئے یہ شعور ضروری تھا کہ ہمارے مقاصد کیا ہیں اور بین الاقوامی سیاست کے پس منظر میں ان کے حصول کی کون سی مناسب صورت ہے۔ اگر مقاصد واضح طور پر ہمارے سامنے ہوتے تو ہمیں یہ فیصلہ کرنے میں مدد دیتے کہ عالمی بساط پر کون ہمارے دوست ہیں اور ان کی مدد کیسے کی جا سکتی ہے اور ان سے مدد کیسے لی جا سکتی ہے۔ ہم نے فارن پالیسی کا بدل لمبی چوڑی تقریروں کو سمجھ لیا جن میں حق و انصاف، انسانیت، آزادی وغیرہ بلند بانگ اقدار پر خطبے دیئے جاتے تھے۔ دوسری قومیں ہمارے یہ خطبے سنتی تھیں اور سر ہلاتی تھیں کیونکہ ان اقدار سے کسی کو انکار نہیں تھا۔ مثلاً کوئی قوم، بڑی سے بڑی استعماری قوم بھی، یہ نہیں کہتی کہ وہ کسی دوسری قوم کی آزادی سلب کرنے کے لئے کوشاں ہے، اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ انہی اقوام نے کمزور اور پس ماندہ اقوام کو غلام بنا رکھا ہے اور وہ انہیں آزادی دینے کے لئے تیار نہیں۔ تو گویا جب پاکستانی نمائندے اعلیٰ اقدار کے محاسن گنواتے تھے وہ بھی ان سے اتفاق کرتے تھے۔ لیکن جب معاملہ ووٹ شماری کا آتا تھا تو فیصلہ کچھ اور ہو جاتا تھا۔ اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔ آجکل کی آزاد قومیں اقوام متحدہ میں شریک ہیں تو اپنے ملکی مفاد کی خاطر۔ وہ اسی بنا پر دوسری اقوام سے تعاون کرتی ہیں اور اسے کبھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتیں۔ اس کے برعکس پاکستان نے نہ اپنا مفاد متعین کیا، نہ دوسروں کا مفاد سمجھا اور نہ کوئی باہمی تعاون کی شعوری کوشش کی۔

سطور بالا سے یہ حقیقت بخوبی سامنے آجاتی ہے کہ ہم نے اپنی کوئی فارن پالیسی متعین نہیں کی اور اس کی وجہ سے ایسا سخت نقصان اٹھایا جو محتاج تشریح نہیں۔ یہ تو غنیمت ہوا کہ اس دوران میں کوئی بین الاقوامی تصادم ایسا نہیں ہوا جس میں قومیں ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہو جاتیں۔ ایسا ہوتا تو ہمیں نظر آجاتا کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں۔ بہرحال اب بھی وقت ہے کہ ہم سابقہ تجربہ کی روشنی میں حقیقت حال پر غور کریں اور اپنی فارن پالیسی متعین کریں۔ اس ضمن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہماری فارن پالیسی کے نقوش و خطوط کیا ہوں۔ نقشے پر دیکھنے سے یہ حقیقت بآسانی سامنے آجاتی ہے کہ پاکستان کے قدرتی دوست وہ مسلمان ممالک ہیں جن کا سلسلہ مغربی پاکستان سے شروع ہو کر ایک طرف ترکی تک جاتا ہے اور دوسری طرف سویز کو عبور کرتا ہوا مغرب اقصیٰ کے انتہائی کونوں تک جا پہنچتا ہے یہ علاقے پاکستان سے ملحق بھی ہیں اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کے باشندوں کے درمیان گہرے قلبی روابط ہیں۔ اس قلبی رشتے کے باوجود ان ممالک میں ملی اتحاد کی کوئی عملی صورت پیدا نہیں ہو سکی۔ اور ہوتی بھی کیسے؟ یہ غریب بھی ہیں اور کمزور بھی۔ اس کا علاج اتحاد میں ہے۔ لیکن اس کے خلاف کئی عناصر سرگرم عمل ہیں۔ سب سے پہلے عربوں کی شدید باہمی رقابت ہے۔ جب سے عثمانی خلافت کا خاتمہ ہوا ہے عالم اسلامی کی قیادت کے کئی دعویدار پیدا ہو گئے ہیں۔ سر فہرست مصر ہے جس کی رگ و پے میں ہوس قیادت سرایت کر چکی ہے وہ دنیائے عرب کو دیکھتا ہے، پھر اس کے تصور کی حدود بر اعظم افریقہ کا احاطہ کرتی ہیں اور پھیلتے پھیلتے عالم اسلامی پر چھا جاتی ہیں۔ وہ خیال ہی خیال میں، مصر قدیم کے باجبروت و پرسطوت فرعونوں کو دیکھتا ہے اور اپنے آپ کو ان کا جانشین نیز افروایشیائی اقوام کا لیڈر تصور کرتا ہے۔ وہ اس تصور کو متشکل کرنے کے لئے عربوں کے نسلی اتحاد کا نعرہ لگاتا ہے، افریقہ میں یورپی استعماریت کی مخالفت کرتا ہے اور عالم اسلامی کو غیر جانبداری کا سبز باغ دکھا کر اپنے پیچھے لگا لینا چاہتا ہے۔ اس کا عربی حریف ہاشمی خاندان ہے جس کے قبضے میں عراق اور اردن ہیں۔ قیادت کا تیسرا حریف سعودی عرب ہے جس نے خاندان ہاشم سے نجد و حجاز چھین لیا ہے۔ وہ اب رفتہ رفتہ مصر سے تعاون پر آمادہ ہو گیا ہے۔

تاکہ خاندان ہاشم کے مقابلہ میں وہ قوی تر ہو جائے۔

اس رقابت کے علاوہ جو دو اور عناصر سرگرم عمل ہیں وہ ہندوستان اور روس ہیں۔ ہندوستان کا آلہ کار مصر ہے وہ اس کی ہوس قیادت کو ابھار ابھار کر اپنی جگہ پیدا کر رہا ہے۔ وہ اس میں اپنا فائدہ دیکھتا ہے کہ عرب مصری قیادت تسلیم کر لیں اور پاکستان سے کٹ جائیں۔ وہ ان ممالک میں اپنے قابل اور عیار ترین نمائندے بھیجتا ہے اور ان کو اس منزل کی طرف لیجانے میں بڑی بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔ اس نے خصوصیت سے عربوں میں یہ پروپیگنڈہ کر رکھا ہے کہ پاکستان انگریز کا پیدا کردہ ہی نہیں بلکہ اب بھی اس کے ہاتھ میں کھیل رہا ہے' نیز وہ عالم اسلامی کی قیادت کا متمنی اور اس کے لئے کوشاں ہے۔ روس اپنے اغراض کے لئے مصروف عمل ہے لیکن سردست اس کا مفاد ہندوستان سے وابستہ ہے۔ چنانچہ وہ ہندوستان ہی کا راستہ صاف کر رہا ہے۔

پاکستان نے یہ سب کچھ دیکھا لیکن اس کا کچھ تدارک نہ سوچا۔ جہاں ہندوستان نے اپنے اہل ترین اور عیار ترین نمائندے بھیجے وہاں پاکستان نے بڑی غفلت اور بے خردی کا مظاہرہ کیا۔ ہمیں نام لینے کی ضرورت نہیں لیکن گذشتہ آٹھ سالوں میں جو جو پاکستانی سفیر اسلامی ممالک میں بھیجے گئے انہوں نے فضا کو اور خراب کیا۔ غالباً ایسے ہی ہونا چاہیئے تھا کیونکہ اگر ایک طرف ان نمائندوں میں تدبر کا فقدان اور جذبۂ صحیحہ کا افلاس تھا تو دوسری طرف خود حکومت پاکستان کے سامنے کوئی متعین پالیسی نہیں تھی جس پر ہمارے نمائندے عمل پیرا ہوتے۔ اس سے ممالک اسلامیہ اور پاکستان میں بعد بڑھتا گیا تا آنکہ حالت وہ ہو گئی جس کا نقشہ اوپر پیش کیا جا چکا ہے۔

چونکہ پاکستان کے قدرتی دوست متصل اسلامی ممالک تھے اس لئے ضروری تھا کہ پاکستان اپنی پالیسی کی خشت اول یہ رکھتا کہ ان ممالک کو باہم متحد کرنا چاہیئے۔ یہ اتحاد بالکل قابل عمل ہے لیکن اس کی شکل احتفال یا موتمر وغیرہ میں نہیں بلکہ مسلم حکومتوں کے باہمی معاہدات ہیں۔ سو اس کے لئے کچھ بھی نہیں کیا گیا۔ ایک مرتبہ حکومت نے مسلم وزرائے اعظم کی کانفرنس کا اعلان کیا لیکن یہ تجویز گئی ایک سسکیوں اور ہچکیوں کے بعد، اپنی موت مر گئی اور نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی فارن پالیسی کا نقطۂ ماسکہ مسلمان ممالک کا حکومتی سطح پر "اتحاد" ہونا چاہیئے۔ "حکومتی سطح" پر نہ کہ ادبی، ثقافتی، احتفالی انداز میں انفرادی سطح پر۔ اس سے بین الاقوامی بساط پر اسلامی بلاک کے لئے قابل عزت جگہ بن جاتی ہے اور مشرق و مغرب کی کشمکش میں توازن پیدا کیا جا سکتا ہے۔ یہاں سے فارن پالیسی کا دوسرا نقطہ سامنے آتا ہے۔ مسلمان ممالک معاشی اعتبار سے پس ماندہ ہیں اور عسکری لحاظ سے کمزور۔ اس کے لئے وہ مجبور ہیں کہ ترقی یافتہ اقوام سے مدد حاصل کریں۔ یہ واقعہ ہے کہ یہ مدد انہیں امریکہ سے مل سکتی ہے اور روس سے نہیں مل سکتی۔ ایک تو روس مطلوبہ مدد دینے سے قاصر ہے، دوسرے اس کی مدد کے ساتھ اشتراکی غلبہ اور روسی استعماریت بھی آتی ہے۔ نیز اسلام اشتراکیت سے کوئی مفاہمت نہیں کر سکتا۔ اس لئے جس امداد کے ساتھ اشتراکیت کے جراثیم بھی آتے ہوں وہ جسد ملت کے لئے کبھی وجۂ توانائی نہیں ہو سکتی۔ ان حالات میں مسلمانوں کا رجحان بحالات موجودہ امریکہ کی طرف ہی ہو سکتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مغربی اقوام سے ملنے میں یہ خدشہ پایا جاتا ہے کہ شاید ان اقوام کا اثر و رسوخ پھر سے بڑھ جائے جن سے مسلمانوں نے بصد دقت گلو خلاصی کرائی ہے لیکن جب ہم اس خدشہ کا حقائق کی روشنی میں مطالعہ کرتے ہیں تو صورت حالات ایسی تشویشناک نظر نہیں آتی۔ سب سے پہلے تو اس حقیقت کو سامنے رکھیئے کہ ہم نے (اور دوسرے مسلمان ممالک نے) بحیثیت دہریکیت غیر مسلم اقوام میں سے کسی دکسی سے مدد لینی ہے۔ اس کے سوا چارۂ کار ہی نہیں۔ جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے، سردست اس کے عزائم استعمارانہ نظر نہیں آتے۔ دوسرے اسے اپنی غرض کے لئے ہماری مدد کی ضرورت ہے۔ وہ ہمارے ساتھ مل کر خلاف اشتراکیت محاذ بنانا چاہتا ہے۔ اس اشتراک تعاون میں ایسا لین دین ہو سکتا ہے جس سے دونوں کا بھلا ہو۔ اگر اب تک اس کا کما حقہٗ فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا تو اس کی وجہ یہی ہے کہ مسلمان ممالک نے انفرادی طور پر معاملہ بازی کی ہے اس سے وہ خسارے میں رہے ہیں۔ اگر مسلمان ملک مل کر ایک مشترکہ محاذ بنا لیں اور اپنے مقاصد کا ایک عمومی منشور تیار کر لیں تو امریکہ کی اس ضرورت سے جو اسے درپیش ہے، نہایت عمدہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ مسلم ممالک میں اس قدر نفسا نفسی ہے کہ انہوں نے اس طریق کار کو آزمایا تک بھی نہیں۔

گو سطور بالا میں اس کی وضاحت کی جا چکی ہے لیکن آخر میں ہم اسے دہرانا ضروری سمجھتے ہیں کہ فارن پالیسی محض اپنے اخلاقی یا انسانی اقدار کا واسطہ دے دیکر التجائیں کرنے کا نام نہیں۔ بلکہ اپنے آپ کو مؤثر بنا کر دوسرے ممالک کی عملی حمایت حاصل کرنے کا نام ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے کشمیر کے معاملہ میں ہندوستان کا رویہ شروع سے لے کر اب تک ایسا رہا ہے جو اخلاقی اور آئینی اعتبار سے بڑا قابل اعتراض ہے۔ دوسری قومیں اسے تسلیم کرتی ہیں لیکن جب اقوام متحدہ میں ان سے ووٹ دینے کا وقت آتا ہے تو وہ ووٹ ہندوستان کے خلاف نہیں دیتیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کی فارن پالیسی پاکستان کے مقابلہ میں کامیاب ہے۔ دوسری مثال اور دیکھئے امریکہ نے پاکستان کو فوجی مدد تو دیدی ہے لیکن اقوام متحدہ میں پاکستان کے حق میں ووٹ نہیں دیا۔ یہ امریکہ کی زیادتی نہیں بلکہ یہ نتیجہ ہے ہماری متعین فارن پالیسی کے نہ ہونے کا۔ اس پالیسی کا مطلب بین الاقوامی میدان میں متعدد دوست پیدا کرنا ہے۔ پاکستان ایسا نہیں کر سکا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اعلیٰ اخلاقی اور انسانی اقدار کو خیرباد کہہ کر دوسروں کی دوستی حاصل کی جائے۔ ہم یقیناً اس انداز سیاست کے کھلے ہوئے دشمن ہیں اور پاکستانی قائدین کو کبھی یہ مشورہ نہیں دیں گے کہ وہ اپنی پالیسی کو ان اقدار سے علیحدہ کر لیں۔ ہم نے تو پاکستان حاصل ہی اس لئے کیا ہے کہ ان اخلاقی اقدار کی عظمت کو برقرار رکھا جائے۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ محض لمبے اصولوں کی مالا جپتے رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ حقیقت ایک گونہ موجب اطمینان ہے کہ سات آٹھ سال کی ناکامیوں اور نامرادیوں کے بعد اب ہماری حکومت کی نگاہوں کا رخ کچھ اس سمت کو بدلا ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ پاکستان ترکی سے معاہدہ بھی کر چکا ہے اور عراقی ترکی معاہدے میں شرکت کی بھی سوچ رہا ہے۔ مانٹریول کی کانفرنس بھی (جسے وزیر اعظم پاکستان نے حال ہی میں طلب کیا تھا اور جس میں مشرق وسطیٰ کے پاکستانی سفیر شریک ہوئے تھے) اس احساس کی مظہر دکھائی دیتی ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اس کانفرنس میں کیا ہوا اور اس کے اثرات کیا ہوں گے۔ لیکن ہم محسوس کرتے ہیں کہ اگر اس میں ان خطوط کو پیش نظر رکھا گیا ہے جن پر اوپر بحث کی گئی ہے اور اس کے مطابق فارن پالیسی مرتب کی گئی ہے تو اس کانفرنس کے نتائج یقیناً دور رس ہوں گے۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔

ایشیائی افریقی کانفرنس

مقالہ افتتاحیہ میں تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے کہ پاکستان کی کوئی متعین فارن پالیسی نہیں۔ غالباً اس کی بین ترین (اور بدترین) مثال ایشیائی افریقی (بندونگ) کانفرنس ہے۔ پاکستان اس میں شریک ہی نہیں بلکہ اس کے داعی ممالک میں سے ہے حالانکہ پس منظر و پیش نہاد کے مطابق یہ اس تحریک کی ضد ہے جو پاکستان کا ہو چکا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ گذشتہ سال جب کوریا کی سیاسی کانفرنس کی تشکیل ہوئی تو ہندوستان نے بڑے جتن کئے کہ اسے کانفرنس میں شریک کر لیا جائے لیکن امریکہ نے اسے نشست دینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اسے ڈر تھا کہ ہندوستان اشتراکیوں کے مطلب کی بات کرے گا۔ ہندوستان اس شکست کا انتقام لینے کی فکر میں رہا تا آنکہ اپریل ۱۹۵۴ء میں جنیوا میں ایک عالمی کانفرنس منعقد ہوئی جس کا محور ہند چینی کی جنگ تھی۔ پنڈت نہرو نے عین اسی موقع پر کولمبو میں سیلون، برما، پاکستان، انڈونیشیا اور ہندوستان کی (جو بعد میں کولمبو ممالک کہلائے) ایک کانفرنس طلب کی۔ انہوں نے اس کانفرنس میں دنیا کو یہ جتانا چاہا کہ ہند چینی میں بہترین ثالث وہ ہو سکتے ہیں۔ اتفاق سے پاکستان نے اس کی مخالفت کر کے یہ ثابت کر دیا کہ پنڈت جی نہ ایشیا کا دماغ ہیں نہ زبان۔ اس وقت پنڈت جی کو اندازہ ہوا کہ مختصر سی کانفرنس میں اپنی بات منوانا مشکل ہے۔ چنانچہ ان کے ذہن رسا نے کولمبو ممالک کی کانفرنس کو وسیع تر بنانے کا منصوبہ تیار کیا۔ بندونگ کانفرنس اسی کا نتیجہ ہے۔ اس میں کم وبیش تیس ممالک شریک ہو رہے ہیں جن میں کوئی قدر مشترک نہیں اور ان کے سیاسی موقف جداگانہ ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جنہوں نے سرخ چین کو تسلیم تک نہیں کیا۔ یہ کانفرنس صحیح معنوں میں بھان متی کا کنبہ ہے۔ اس کا کوئی ایجنڈا بھی نہیں نہ ہی مدعوین یا منتظمین کا یہ خیال ہے کہ اس میں کوئی فیصلے کئے جائیں (ضمناً، اگر فیصلے کر بھی لئے جائیں تو ان پر عمل درآمد کرانے کی کوئی صورت نہیں۔ ان حالات میں بظاہر کانفرنس نشستند و گفتند و برخاستند سے آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ لیکن نہیں، اس کا انعقاد خالی از علت نہیں۔ ہندوستان متضاد فکر

وخیال کی قوتوں کو اکٹھا کرکے پاکستان جیسے ملکوں کی مخالفت کو مخالفت کو عوامی نعروں سے دبا دینا چاہتا ہے۔ "ایشیا ایشیا والوں کے لئے ہے" "ہم جنگ میں غیر جانبدار رہیں گے"، "استعماریت مردہ باد" وغیرہ۔ کون شخص ہوگا جو ان نعروں کی مخالفت کی جرأت کرے گا؟ لیکن ان کا مفہوم کیا ہے؟ اس دورہ کے شروع میں جاپان نے "ایشیا ایشیا والوں کے لئے" کا نعرہ بلند کیا تھا، تو اس نے رفتہ رفتہ تیاری کرکے بالآخر مشرق بعید اور جنوب مشرقی ایشیا پر قبضہ کر لیا تھا۔ بعینہٖ یہی خواب ہندوستان دیکھ رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایشیا کا قائد سمجھتا ہے۔ لیکن جب تک امریکہ اور برطانیہ یہاں موجود ہیں، اس کی قیادت خطرے میں ہے۔ لہٰذا وہ ایشیا کو ان سے خالی دیکھنا چاہتا ہے۔ سرخ چین کے عزائم بھی ایسے ہی ہیں، اس سے ہندوستان اور چین میں رقابت شروع ہو گئی ہے، لیکن دونوں یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے ایشیا کو اقوام مغرب سے خالی کرانا چاہیئے، چنانچہ اپنی اپنی قیادت کا راستہ صاف کرتے ہوئے بھی وہ اس اساسی مطالبہ پر متفق ہیں۔ چین کے لئے اس کانفرنس کا ایک اور پہلو بھی ہے، اگرچہ اسے بہت سے ممالک نے تسلیم نہیں کیا اور وہ باوجود سعی بسیار اقوام متحدہ کا رکن نہیں بن سکا، تاہم یہ پہلا موقعہ ہے کہ وہ اتنی عظیم کانفرنس میں شرکت کا فخر حاصل کر رہا ہے۔ جو کرۂ ارض کی نصف آبادی کی نمائندہ ہے۔ وہ اس کا یوں فائدہ اٹھا سکے گا کہ ایک طرف فارموسا کے معاملہ میں امریکہ کو جنگ پسند ثابت کردے اور دوسری طرف اپنے حق میں اخلاقی فضا پیدا کرے۔

اس کانفرنس کو پاکستانی سیاست کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس کی کوئی کل سیدھی نظر نہیں آئے گی۔ مثلاً پاکستان سیٹو (SEATO) کا رکن ہے، اس معاہدہ دفاع میں امریکہ سمیت آٹھ قومیں ہیں اور اس کا واضح مقصد اشتراکی جارحیت کی روک تھام ہے۔ ہندوستان اس میں شریک نہیں کیونکہ جو تنظیم ایشیائی اقوام کو امریکہ جیسے ملک سے وابستہ کرے ہندوستان کبھی پسند نہیں کر سکتا۔ اس سے اس کی ہوس قیادت کو زبردست صدمہ پہنچتا ہے۔ چین تو اور زیادہ شدت سے اس کا مکتہ چیں ہے، وہ اس معاہدہ کو امریکہ کی جنگی تیاری کا نام دیتا ہے، اور صاف طور پر اپنے خلاف قرار دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس کانفرنس میں ہندوستان اور چین شامل ہوں گے، اس میں سیٹو کے حق میں کوئی کلمۂ خیر نہیں کہا جا سکے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس میں کوئی قرارداد مذمت بھی منظور نہیں کی جائے گی۔ لیکن پاکستان کے پاس اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ "ایشیا ایشیا والوں کے لئے ہے" قسم کے نعروں کے شور میں ایشیا اور افریقہ کی قوموں کو یہ جتا سکے کہ اس نے ایک ایشیائی ملک ہونے کے باوجود سیٹو کی شرکت سے اقوام مغرب کے ساتھ جو رابطۂ اتحاد قائم کیا ہے۔ یہ فیصلہ بالکل حق بجانب اور درست ہے اور دوسرے ممالک کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیئے یہ خطرہ اور زیادہ یقینی ہو جاتا ہے کیونکہ پاکستان نے ہم خیالوں کا ایسا محاذ قائم نہیں کیا۔ جو اس کے موقف کی تائید کریں۔ اندریں حالات ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان نے اس کانفرنس کے ممکنات کو کماحقہٗ سمجھے بغیر اس کی تجویز کو قبول کر لیا۔ پاکستانی نقطۂ نگاہ سے ایسی بے ہنگم کانفرنس کی مطلقاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہمیں ڈر ہے کہ اس سے پاکستانی موقف کو شدید نقصان پہنچے گا۔ اس نقصان کو کم سے کم کرنے کے لئے پاکستان کو بڑی ہوشیاری اور بیدار مغزی سے کام لینا ہوگا۔ وہ اگر ان ممالک کو جو پاکستانی موقف کے موید ہیں اکٹھا کرلے اور وہ سب مل کر ایک متحدہ محاذ قائم کرلیں تو گو وہ اقلیت میں ہوں گے مگر وہ اپنے آپ کو بہت حد تک موثر بنا سکیں گے اور دوسروں کو مجبور کر سکیں گے کہ وہ ان کی بات سنیں۔ یہ نہ کیا گیا تو پاکستان اس ہجوم مخالف میں تنہا ہوگا۔

اس کانفرنس پر تبصرہ کرتے ہوئے ہمارے وزیر اعظم نے ۱۰؍اپریل کو ایک بیان میں کہا

"ہم نے اپنی تجویزیں تیار کر لی ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ ہماری اپنی فارن پالیسی ہے۔"

ہم اپنی گذارشات کے بعد اس بیان پر کوئی تبصرہ نہیں کرتے۔ البتہ کانفرنس کی روئداد سے اندازہ لگا لیں گے کہ ان بظاہر خوش کن الفاظ میں کس قدر صداقت اور حقیقت ہے، اور کون سا موقعہ ایسا ہوا ہے جس میں ہماری تائید کی طرف سے ہمارے کانوں میں اس قسم کے خوش کن الفاظ نہیں پہنچے اور نتائج نے ان کی تکذیب نہیں کر دی۔

مجرمانہ خاموشی

یہ فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ ہمارے اقلیتی وزیر مسٹر غیاث الدین

پچھان اور ہندوستان کے نائب وزیر امور خارجہ، مسٹر اے، کے چندہ مغربی بنگال، مشرقی پاکستان اور تری پورہ کا دورہ کرکے ہندو اقلیت کے حالات کا مطالعہ کریں، ہم ۲؍اپریل کی اشاعت میں اس بے بنیاد ہندوستانی پروپیگنڈے کا تفصیلی جائزہ دے چکے ہیں کہ ہندو مشرقی پاکستان چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں لہٰذہ اس وقت ہم تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔ ہم اس وقت پچھان صاحب اور حکومت پاکستان کو یہ جتانا چاہتے ہیں کہ انھوں نے اس دورے پر آمادگی کا اظہار کرنے کے لئے دنیا کے سامنے یہ اعتراف کر لیا ہے کہ مسلمان جو ہندوستان میں امن و عافیت سے بس رہے ہیں وہ اپنا وطن قطعاً نہیں چھوڑ رہے لیکن ہندوؤں کا پاکستان میں رہنا دشوار ہے۔ وہ یہاں سے بھاگ رہے ہیں۔

ہمیں اس دورے پر کوئی اصولی اعتراض نہیں کیونکہ ہم دنیا کی نگاہوں سے کچھ چھپانا نہیں چاہتے، لیکن سوال یہ ہے کہ ہندوستان سے لاکھوں کی تعداد میں جو مسلمان مسلسل پاکستان آ رہے ہیں، ان کے حالات و کوائف کا مطالعہ کیوں ضروری نہیں سمجھا جاتا؟ کیا پانچ سالوں میں ساڑھے پانچ لاکھ سے اوپر مہاجرین کا پاکستان صرف ایک راستے یعنی کھوکھراپار سے آ جانا اور ان کا بدستور آتے چلے جانا تشویشناک لہٰذا لائق تفتیش و تحقیق کیوں نہیں؟ ہندوستان کی خاموشی اس معاملہ میں قابل فہم ہے لیکن ہمارے اقلیتی وزیر کیوں منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے ہوئے ہیں؟ یہ خاموشی مجرمانہ ہے کس قدر افسوسناک اور قلق انگیز ہے یہ صورت حال کہ ہندوستان کی طرف سے ذرا سا شور اٹھتا ہے تو ہمارے ارباب حکومت حجت سے ملزمین کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر اپنی مدافعت کرنا شروع کر دیتے ہیں، اور ہندوستان سے اتنا بھی نہیں کہتے کہ ہم پر یہ الزام لگاتے وقت تمہیں شرم نہیں آتی؟ تمہیں دوسروں کی آنکھ کا تنکا تو نظر آ جاتا ہے لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر کبھی دکھائی نہیں دیتا!

اقبال نمبر

طلوع اسلام کا آئندہ شمارہ بابت ۲۳؍اپریل تماماً علامہ اقبال سے متعلق مضامین پر مشتمل ہوگا۔ یوں تو طلوع اسلام علامہ اقبال ہی کی یادگار میں شائع کیا گیا ہے اور اس کی ہر اشاعت انہی کے پیغام کی علمبردار ہوتی ہے جو قرآنی اصولوں پر مبنی ہے لیکن چونکہ ۲۱؍اپریل آپ کا یوم وفات ہے اور یہ دن اس حیثیت سے منایا جاتا ہے، اس موقعہ پر طلوع اسلام نے علامہ اقبال کی تعلیمات سے متعلق متفرق گوشوں پر منتشر مضامین کو اس اشاعت میں جمع کر دیا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس اشاعت کی ضخامت عام اشاعتوں سے بڑھ جائے لیکن قیمت بہرحال زیادہ نہیں ہوگی یعنی وہی چار آنے۔

ایجنٹ حضرات جتنی کاپیاں زیادہ منگوانا چاہیں، انہیں فی الفور مطلع کریں۔ تاکہ مطلوبہ تعداد کے مطابق پرچے چھاپے جائیں۔ تاخیر کی صورت میں ان کی مانگ کو پورا کرنا آسان نہیں ہوگا۔

یہ پرچہ جس پر ہفتہ (یعنی ۲۳؍اپریل) کی تاریخ ہوگی، حسب معمول منگل کو پریس میں بھیج دیا جائے گا۔ اور تیار ہو کر جمعرات (۲۱؍اپریل) کو کراچی میں بھی تقسیم ہو جائے گا، اور ڈاک کے سپرد بھی کر دیا جائے گا۔ ضمناً عام قارئین کی اطلاع کے لئے گذارش ہے کہ کتابت اور طباعت کی سست رفتاری کی وجہ سے ہر پرچہ جس پر تاریخ ہفتے کی ہوتی ہے منگل کی شام تک مرتب کرکے پریس میں بھیج دیتے ہیں، جہاں سے چھپ کر بدھ کی شام کو دفتری کے پاس کٹائی اور جزبندی کے لئے پہنچ جاتا ہے۔ جمعرات کو پرچہ کراچی میں تقسیم ہو جاتا ہے اور ڈاک خانے میں بھی دے دیا جاتا ہے، طلوع اسلام کے ہفتہ واری تبصرے انہی دنوں کے مطابق ہوتے ہیں، لہٰذا قارئین پڑھتے وقت اسے پیش نظر رکھیں کہ ہفتہ کی تاریخ والے پرچے میں زیادہ سے زیادہ سابقہ منگل کی صبح تک کا تبصرہ شامل ہو سکتا ہے۔

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

پرویز صاحب

یوم اقبال کے سلسلہ میں ڈھاکہ تشریف لے جانے کا قصد رکھتے ہیں اگر وہ تشریف لے گئے تو محترم ایس۔ این باقر صاحب ۹ نور روڈ، رمنا بازار ڈھاکہ

تاریخی شواہد

(۱)

باقی رہا یہ کہ حضرت نوحؑ نے اپنی دعا میں یہ کہا تھا کہ

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ۝ (۲۶/۷۱)

اے میرے رب ان نہ ماننے والوں میں سے کسی کو بھی ارض پر باقی نہ چھوڑ۔

تو اس میں (الْأَرْضِ) سے مراد تمام صفحۂ ارض نہیں بلکہ وہ ملک ہے جس میں وہ قوم بستی تھی۔ قرآن کریم میں متعدد شواہد موجود ہیں جن میں "الارض" سے مراد ایک خاص علاقہ ہے۔ مثلاً قصۂ حضرت موسیٰؑ میں فرمایا ہے کہ

وَإِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْأَرْضِ (۸۳/۱۰)

اور اس میں شک نہیں کہ فرعون ملک (مصر) میں بڑا ہی سرکش بادشاہ تھا۔

یہاں الارض ملکِ مصر کے معنے آیا ہے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ فرعون کی سرکشی اور تمرد اور غلبہ و تسلط تمام روئے زمین پر نہیں تھا بلکہ ایک خاص ملک کے اندر محدود تھا۔ اسی طرح حضرت داؤدؑ کے متعلق فرمایا:

يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (۳۸/۲۶)

اے داؤد ہم نے تجھے ملک (ارض) میں حاکم بنایا ہے۔ سو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو۔

یہاں بھی ظاہر ہے کہ حضرت داؤد کی سلطنت تمام صفحۂ ارض پر نہیں تھی۔ بلکہ ایک خاص خطۂ ملک میں تھی۔ لہذا ان مقامات میں الارض سے مراد تمام روئے زمین نہیں بلکہ وہ خاص علاقہ ہے جس سے واقعۂ زیرِ نظر کا تعلق ہے۔ یہی مفہوم قصۂ حضرت نوحؑ میں "الارض" سے ہے

حضرت نوحؑ کی عمر کے متعلق قرآن کریم میں ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا ۝ (۲۹/۱۴-۱۵)

اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ ان میں پچاس برس کم ہزار سال رہا۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت نوح کی عمر ساڑھے نو سو سال کی تھی؟ اگر تورات کی طرف جائیے تو حضرت نوح آدم سے دسویں پشت میں آتے ہیں اور ان تمام کی عمریں آٹھ آٹھ، نو نو سال کی لکھی ہیں۔ چین کے مذہب (TAOISM) کا ایک بہت بڑا مبلغ (KWANG) جو چوتھی صدی قبل مسیح میں گذرا ہے۔ وہ یہ بتلانے کے بعد کہ عمر بڑھانے کا کیا طریقہ ہے، لکھتا ہے کہ

میں بارہ سو سال سے اسی طریق[1] کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہوں اور اس پر بھی میرا جسم روبہ انحطاط نہیں ہوا۔

لیکن قدیم زمانہ کی تاریخ میں بادشاہوں کی عمریں عام طور پر بہت لمبی لمبی لکھی گئی ہیں۔ اب ان روایات سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں کسی مورثِ اعلیٰ کی عمر سے مقصود یہ ہوتا تھا کہ اس کے خاندان میں حکومت کتنے عرصہ تک رہی۔ یہ عرصۂ حکومت اس مورثِ اعلیٰ کی عمر لکھا جاتا تھا۔ یعنی خاندان کے بجائے خاندان کے مورثِ اعلیٰ کا نام ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے قیاس یہی ہے کہ حضرت نوحؑ کی عمر سے مراد وہ زمانہ ہے جس میں ان کی تعلیم جاری رہی۔ زیرِ نظر آیت میں ہے فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا (۲۹/۱۴) اس میں ایک ہزار کے ساتھ سَنَةٍ کا لفظ آیا ہے اور خَمْسِينَ کے ساتھ عَامًا کا۔ سنۃ اور عاماً دونوں کے معنی سال ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ سنۃ بالعموم اس سال کو کہتے ہیں جس میں سختیاں آئیں اور عاماً خوش حالی کے سال کو کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے اس آیت کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی تعلیم پہلے پچاس سال تو نہایت عمدگی سے جاری رہی لیکن اس کے بعد ان کے متبعین پر سختیوں کا دور شروع ہو گیا۔

اس ساڑھے نو سو برس کی مدت کو حضرت نوح کے زمانہ شریعت پر اس لئے بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مندرجہ صدر آیت کے بعد ہی حضرت ابراہیمؑ کا ذکر شروع ہو جاتا ہے اور تورات کی رُو سے حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں نو سو باون سال کا فرق ہے۔ اگرچہ خود تورات اور تاریخ کے دیگر شواہد کی روشنی میں دیکھا جائے تو حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ قریب اڑھائی ہزار سال قبل مسیح تک متعین ہوتا ہے۔ بہرحال یہ ہنوز تاریخ کے قیاسات ہیں اور چونکہ قرآن نے ان حضرات کے زمانہ کے متعلق بحث نہیں کی اس لئے ان قیاسات میں سے جو بھی حقیقت کے قریب ہوں (یا بعد کے انکشافات انہیں ایسا ثابت کر دیں) انہیں درست سمجھا جائے گا۔

یہ ہے قوم نوحؑ کی وہ داستان عبرت انگیز جسے اللہ تعالیٰ نے حضور پر وحی فرمایا

تِلْكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ ۖ مَا كُنتَ تَعْلَمُهَا أَنتَ وَلَا قَوْمُكَ مِن قَبْلِ هَٰذَا ۖ فَاصْبِرْ ۖ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ ۝ (۱۱/۴۹)

(اے پیغمبر!) یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جسے ہم وحی کے ذریعے تجھے بتلا رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تو یہ باتیں تو جانتا تھا اور نہ تیری قوم۔ پس تو ان تاریخی شواہد کی روشنی میں اپنے منصب پر استقامت سے جما رہ۔

عیسائی معترضین اکثر کہا کرتے ہیں کہ حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کے قصے نبی اکرمؐ کے زمانے میں عام طور پر مشہور تھے اور یہود اور عیسائی علماء اکثر ان کا تذکرہ کرتے رہتے تھے اس لئے حضور اور اہل عرب ان سے واقف تھے پھر یہ کہنا کس طرح درست ہے کہ یہ وہ امورِ غیب ہیں جن سے۔ نبی اکرمؐ آگاہ تھے نہ ان کی قوم؟ اس میں شبہ نہیں کہ اس زمانے کے لوگ ان قصص کی عمومی حیثیت سے متعارف تھے لیکن جو تفاصیل قرآن کریم نے بیان فرمائی ہیں، نہ صرف یہ کہ وہ زبان زدِ خلائق ہی نہ تھیں بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں کے لٹریچر میں بھی موجود نہ تھیں۔ قصۂ قوم نوح کا ماخذ تورات ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن ذرا تورات کے بیان کردہ قصے اور قرآن کریم کا مقابلہ کر کے دیکھئے حقیقت واضح طور پر سامنے آجائے گی کہ (موجودہ) تورات کے بیان میں ذہنِ انسانی کی فسانہ طرازی کا کس قدر دخل ہے۔ اور قرآن کریم کے بیان میں کس قدر صداقت و پاکیزگی ہے۔ قصص قرآن کا ایک خاص اسلوب یہ ہے کہ ان سے مورخانہ تاریخ نگاری مقصود نہیں ہوتی، بلکہ قصہ کی صرف وہی کڑیاں بیان کی جاتی ہیں جن سے کوئی نہ کوئی اہم نتیجہ اخذ کیا جانا مطلوب ہو۔ قصۂ قوم نوح میں اہم نقاط یہ ہیں کہ حضرت نوح نے اپنی قوم کو خدائے واحد کی اطاعت کی دعوت دی۔ قوم کے سرکش اور متمرد طبقہ نے اس دعوت کی تکذیب و مخالفت کی اور جب پانی سر سے گزر گیا تو ان کے ان جرائم کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے انہیں طوفان کے ذریعے ہلاک کر دیا۔ اب دیکھئے کہ بائبل اس طوفان کی وجہ کیا بیان کرتی ہے۔ تورات کی کتاب پیدائش میں ہے

اور خداوند خدا نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی اور اس کے دل کے تصور اور خیال روز بروز صرف بد ہی ہوتے ہیں ۞ تب خداوند زمین پر انسان کے پیدا کرنے سے پچھتایا اور نہایت دل گیر ہوا ۞ اور خداوند نے کہا کہ میں انسان کو جسے میں نے پیدا کیا زمین پر سے مٹا ڈالوں گا۔ انسان کو اور حیوان کو بھی۔ اور کیڑے مکوڑے اور آسمان کے پرندوں تک۔ کیونکہ میں ان کے بنانے سے پچھتاتا ہوں ۞ مگر نوح پر خدا کے مہربانی کی نظر کی۔ (پیدائش ۶/۵-۸)

ذرا غور فرمایئے۔ تورات کا بیان یہ ہے کہ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) خالقِ ارض و سموٰت نے بنانے کو تو یہ مخلوق بنا دی لیکن بنانے کے بعد اس پر سخت پشیمان اور متاسف ہوا اس لئے اس نے فیصلہ کر دیا کہ میں اپنی مخلوق کو صفحۂ ارض سے نابود کر دوں گا۔ یہ تھا وہ "مقصدِ عظیم" جس کے لئے طوفانِ نوح برپا کیا گیا۔

اسلامی معاشرت
مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ صفحات ۱۹۲ ✱ قیمت دو روپے

[1] SACRED BOOKS OF The EAST. (Taoism) Trnslated By JAMES Legge p. 25.

صورتِ قرآن

(۱۰)

(۲) وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (بنی اسرائیل ع ۳ و ۴)

اور تمہارا پروردگار تم کو حکم دیتا ہے کہ :-

(الف) بجز اللہ کے کسی کی اطاعت و فرماں پذیری قبول مت کرو۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ۝

(ب) اور تم ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کیا کرو اور اگر وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں۔ سو ان کی کسی بات پر اُف تک نہ کرنا۔ اور نہ کسی بات پر جھڑکنا اور ان سے نہایت ادب سے گفتگو کرنا اور ان کے سامنے شفقت و انکساری کے ساتھ جھکے رہنا اور ان کے لئے یوں دعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار! ان دونوں پر رحمت فرما جیسا کہ انہوں نے میرے بچپن میں تربیت فرمائی ہے۔ تمہارا رب تمہارے مافی الضمیر کو خوب جانتا ہے۔ اگر تم سعادتمند ہو تو وہ خدا کے قانون کی طرف رجوع کرنے والوں کو سامان حفاظت عطا کرنے والا ہے

(ج) وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ

اور قرابت داروں کو ان کا حق

(د) وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ

اور محتاجوں اور مسافروں کے حقوق ضرور ادا کرتے رہنا۔

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ۝

(ہ) اور بے موقع پیسہ نہ اڑانا۔ بے شک بے موقع اڑانے والے شیطان کے بھائی بند ہیں اور شیطان تو اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے ہی۔

وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاۗءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ۝

(و) اور اگر کسی کو دینے کے لئے پیسے نہ ہوں اور تم کو تنگدستی ہو اور تم اپنے پروردگار کی مہربانی کی راہ دیکھ رہے ہو اور اس وجہ سے تمہیں ان حقداروں سے منہ پھیرنا پڑے، تو تم کو چاہیئے کہ نرمی کے ساتھ ان سے معذرت کر کے ان کو سمجھا دو۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۝

(ز) اور نہ ہی بخل سے پیش آؤ۔ اور نہ بے حد احسان و سلوک اور خیر خیرات کے معاملے میں نہ تو ایک دم ہاتھ روک ہی لینا چاہیئے اور نہ بالکل ہی پھیلا دینا چاہیئے۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ یہ نکلے گا کہ الزام خوردہ اور تہی دست ہو کر بیٹھ رہو گے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ۝

بیشک تمہارا پروردگار جس کو چاہتا ہے زیادہ رزق دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے تنگدستی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ بلاشبہ وہ اپنے بندوں کو خوب جانتا، دیکھتا ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْـيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝

(ح) اور اپنی اولاد کو ناداری کے ڈر سے قتل نہ کرنا ان کو اور تم کو ہم ہی رزق دیتے ہیں اس کے علاوہ اولاد کا مار ڈالنا بڑا بھاری گناہ ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ۝

(ط) اور زنا کے تو پاس بھی نہ پھٹکنا۔ بلاشبہ وہ بڑی ہی بے حیائی کا فعل ہے اور بہت بری راہ ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۝

(ی) اور کسی بھی ایسے شخص کو ناحق جان سے نہ مارو۔ جسے قتل کرنا اللہ نے حرام کر دیا ہے اور جو شخص ناحق قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے وارث کو قصاص کا حق دیدیا ہے۔ سو اس کو بھی چاہیئے کہ خونریزی میں زیادتی نہ کرے اور حد سے بڑھ نہ جائے حد کے اندر رہنے میں فتحمند ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۠ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـــُٔوْلًا ۝ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝

(ک) اور یتیم کے مال کے پاس نہ جانا۔ ہاں مگر یہ کہ ایسے طریقہ پر جو کہ مستحسن ہو۔ یہاں تک کہ وہ سن بلوغ کو پہنچ جائیں، اور تم ان کی امانت ان کے حوالہ کر دو۔ اور جو عہد کیا کرو اس کو ضرور پورا کیا کرو۔ عہد کے بارے میں یقیناً تم سے باز پرس ہوگی۔

(ل) اور جب کوئی چیز ناپو اور تولو تو پورا پورا ناپو اور صحیح ترازو سے ٹھیک ٹھیک تولو۔ کہ یہی عمدہ بات ہے اور انجام بھی اسی کا اچھا ہوگا۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْــــُٔــوْلًا ۝

(م) اور جس بات کا تم کو علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑو۔ یاد رکھو کہ کان، آنکھ اور عقل (یا دل)، سب کے بارے میں ہر شخص سے باز پرس ہوگی۔

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ۝ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۭ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝

(ن) اور زمین پر اکڑ کے اور اترا کے نہ چلا کرو کیونکہ نہ تو تم زمین ہی کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑوں کی لمبائی تک تم پہنچ سکتے ہو۔

یہ سارے بُرے کام بطور خاص تمہارے پروردگار کے نزدیک حد درجہ ناپسندیدہ ہیں اور یہ باتیں اس حکمت میں کی ہیں جو تمہارے پروردگار نے وحی کے ذریعے سے تم کو بھیجی ہیں۔ اور ہاں خدا کے سوا کسی کے ساتھ کوئی اور قبلۂ اطاعت نہ تجویز کر لینا۔ ورنہ تم الزام خوردہ اور راندہ کر کے ایسے ماحول میں پھینک دیئے جاؤ گے جہاں انسانیت ذبح کی جاتی ہوگی۔

(بنی اسرائیل رکوع ۳ و ۴)

مجلسِ اقبال

[اس وقت تک خودی کے متعلق مختلف گوشوں سے اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ ہمارے خیال میں، اب اس حقیقت کو سمجھنے میں وقت نہیں ہوگی کہ خودی سے اقبالؔ کی مراد کیا ہے۔ اس کے بعد، اصل کتاب (مثنوی اسرارِ خودی) کی تشریح شروع ہو جانی چاہئے تھی۔ لیکن زیرِ نظر شمارہ کے بعد، اگلا پرچہ خود اقبالؔ نمبر ہوگا جس میں پیامِ اقبال کے متنوع گوشوں کو سامنے لایا جائے گا۔ اندریں حالات مناسب یہی سمجھا گیا ہے کہ مثنوی کا آغاز اس کے بعد ہو تاکہ اس کے تسلسل میں فرق نہ آئے۔ زیرِ نظر شمارہ میں خودی کا وہ مفہوم پیش کیا جاتا ہے جسے ضربِ کلیم کے عربی ترجمہ (از محترم ڈاکٹر عبدالوہاب عزام مدظلہٗ) کے مقدمہ میں، پرویز صاحب نے لکھا تھا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس موضوع پر اس کے بعد کچھ اور لکھنے کی ضرورت نہیں۔ طلوعِ اسلام]

اقبال کے عمومی مطالعہ کے ضمن میں ایک چیز ایسی ہے جسے مدِ نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ شاعری میں عربی اور فارسی لغت کے اکثر الفاظ ایسے ہیں جنہیں وہ ان کے لغوی معنوں میں استعمال نہیں کرتا۔ بلکہ وہ کلامِ اقبال کی خاص اصطلاحات ہیں۔ جب تک ان الفاظ کے اصطلاحی معانی سمجھ میں نہ آئیں، اقبال کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آ سکتا۔ مثلاً علم و عشق، عقل و دل، ذکر و فکر، خبر و نظر، سوز و ساز، یاد و دانش، قلندر، مردِ حُر۔ الفاظ اسی قبیل کے ہیں۔ یہ تمام اصطلاحات اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن وہ اصطلاح جو فکرِ اقبال میں محور کا حکم رکھتی ہے اور جس کے گرد اس کا سارا کلام گردش کرتا ہے۔ خودی ہے۔ اقبال سے پہلے یہ لفظ ہمارے ہاں غرور اور تکبر کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ لیکن اقبالؔ نے اسے بالکل جداگانہ معنی پہنا دیئے اور یہ مفہوم اب اس درجہ رائج ہو چکا ہے کہ اس لفظ کے قدیمی معانی بالکل نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔

"خودی سے اقبالؔ کا مفہوم کیا ہے؟" اس سوال کا جواب مختصر الفاظ میں دینا آسان نہیں۔ اس لئے کہ اقبال کا فلسفہ درحقیقت فلسفۂ خودی ہے اور جب تک اقبالؔ کا پورا فلسفہ سامنے نہ آ جائے اس اصطلاح کا صحیح مفہوم بھی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اس تفصیل و اطناب کا یہ موقع نہیں۔ لیکن چونکہ ضربِ کلیم میں بھی یہ لفظ بار بار سامنے آئے گا اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قلیل ترین الفاظ میں اس اصطلاح کا طائرانہ سا تعارف کرا دیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ کیا انسان کی انفرادیت، شخصیت یا انا کوئی مستقل حقیقت ہے یا محض فریبِ تخیل؟ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے مفکرین نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش نہ کی ہو۔ افلاطون اور اس کی اتباع میں حکمائے ایران اور ہند، اس نتیجے پر پہنچے کہ کائنات میں صرف حیاتِ کلی کا وجود ہے۔ انسانی ذات (انا یا شخصیت) محض فریب ہے۔ یہ فریب عمل کے ذریعہ قائم رہتا ہے اور عمل کی بنیاد پر ہے۔ لہٰذا اس فریب سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ یہ ہے کہ انسان ترکِ آرزو سے ترکِ عمل کرے اور اس طرح انسانی ذات کا حباب ٹوٹ کر حیاتِ کلی کے بحر میں گم ہو جائے۔ اس رفنائے ذات کا نام نجات ہے اور یہی زندگی کا مقصود ہے۔ یہی وہ فلسفۂ حیات تھا جو ہمارے ہاں نظریۂ وحدت الوجود کے نام سے رائج ہوا اور جس نے مسلمانوں جیسی ہمہ تن عمل قوم کو خاک کے آغوش میں سلا دیا۔

اقبالؔ نے اس فلسفۂ حیات کے خلاف مسلسل احتجاج کیا اور اس کے برعکس فلسفۂ خودی پیش کیا۔ اس فلسفہ کا ملخص یہ ہے کہ حیات عالمگیر یا کلی نہیں بلکہ انفرادی ہے۔ حتیٰ کہ خدا بھی ایک فرد ہے اگرچہ وہ اپنی انفرادیت میں یگانہ اور نادر ہے۔ اس انفرادی زندگی کی اعلیٰ ترین صورت کا نام خودی ہے جس سے انسانیت کی شخصیت یا انفرادیت متشکل ہوتی ہے۔ لہٰذا انسانی زندگی کا مقصود سلبِ ذات نہیں بلکہ اثباتِ خودی ہے۔ اقبال کے نزدیک، جوں جوں انسان، اس فردِ کامل و نادر کی مانند ہوتا جاتا ہے (جسے انائے مطلق یا خدا کہتے ہیں) وہ خود بھی منفرد اور نادر ہوتا جاتا ہے۔ اس کا نام استحکامِ خودی ہے۔ "خدا کی مانند" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے اندر صفاتِ خداوندی کو منعکس اور اس طرح اُس انائے مطلق کو اپنے اندر جذب کرتا جائے۔ خودی کے ضعف اور استحکام کے پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ انسان اپنی راہ میں آنے والے موانعات پر کس حد تک غالب آتا ہے۔ زندگی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مادہ شر ہے اور اس لئے قابلِ نفرت۔ مادہ شر نہیں بلکہ یہ زندگی کی خوابیدہ قوتوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہے۔ جب انسانی خودی، موانعات پر غلبہ حاصل کرنے سے پختہ ہو جاتی ہے تو پھر موت کا جھٹکا اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس طرح انسانی زندگی، دوام سے ہم کنار ہو جاتی ہے۔ بنا بریں ہر وہ عمل جس سے خودی میں استحکام پیدا ہو، خیر ہے۔ اور ہر وہ کام جس سے خودی کمزور ہو جائے شر ہے۔

اقبالؔ کے نزدیک، ارتقائے خودی کا پہلا مرحلہ، تخلیقِ مقاصد یا تولیدِ آرزو ہے۔ آرزو عینِ حیات اور اصل قوت ہے کیونکہ یہی عمل کی محرک ہوتی ہے۔

تخلیقِ مقاصد کے بعد دوسرا مرحلہ حصولِ مقاصد کے لئے جہدِ مسلسل ہے۔ حصولِ مقصد کے لئے اسی تپش و خلش کا نام، اقبال کی اصطلاح میں عشق ہے۔ اس جد و جہد کی کامیابی کے لئے تین شرائط ناگزیر ہیں۔ اول اطاعت، اطاعت سے مراد ہے قوانینِ خداوندی (قرآن) کی کامل اتباع جس کے لئے قرآنی معاشرہ کی تشکیل ضروری ہے۔ اس اطاعت سے انسان کے اندر ضبطِ نفس پیدا ہو جاتا ہے اور یہ دوسری شرط ہے۔ ضبطِ نفس سے مراد خواہشات کا دبانا نہیں۔ بلکہ امالہ یا کفالت (ذاتی قوتوں کا رُخ دوسری طرف بدل دینے) سے ان میں توازن پیدا کرنا ہے۔ اس توازن کی اکمل ترین شکل ذاتِ خداوندی ہے جس میں متضاد صفات کا باہمی توازن اپنی انتہا تک پہنچا ہوا ہے۔

اس تطہیرِ فکر و عمل اور تہذیبِ نفس سے انسان اس مقام تک جا پہنچتا ہے جسے اقبالؔ نیابتِ الٰہیہ سے تعبیر کرتا ہے اور یہ تیسری شرط ہے۔ نیابتِ خداوندی سے اقبال کا مفہوم وہ قوتِ مجریہ ہے جو دنیا میں قوانینِ خداوندی (ضابطۂ قرآنی) کی تنفیذ و ترویج کا موجب بنتی ہے۔ (نیابتِ الٰہیہ سے یہ مراد نہیں کہ انسان، خدا کا قائم مقام یا جانشین بن جاتا ہے اس لئے کہ جانشینی صرف اس کی ہوتی ہے جو خود موجود نہ ہو)۔ یہ مقامِ مومن ہے اور یہی مقام، اقبال کے نزدیک استحکامِ خودی کا آخری نقطہ ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر انسان ساری دنیا پر غالب آ جاتا ہے، دنیا اس پر غالب نہیں ہوتی، اس کیفیت کا نام اقبالؔ کی اصطلاح میں، فقر و درویشی یا قلندری ہے۔ یعنی سب کچھ مسخر کر لینے کے بعد وہ استغنا جو اللہ کی صفتِ صمدیت اور "غنیٌ عن العلمین" کا مظہر ہو۔ ان افراد پر مشتمل جماعت کا نام امتِ مسلمہ ہے اور اسی جماعت کی نشاۃِ ثانیہ پیامِ اقبال کا منتہیٰ و مقصود۔ وہ امت جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

میانِ اُمّتاں والا مقام است کہ آں اُمّت دو گیتی را امام است
نیاساید ز کارِ آفرینش کہ خواب و خستگی بر وے حرام است

اور

بیا عناں عمد یابے خوش ضمیرے بر اغاں جرّہ بازے زود گیرے
امیرِ او بسلطانی فقیرے فقیرِ او بہ درویشی امیرے

لتکونوا شہداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شہیدًا۔

آپ طلوعِ اسلام کی مدد کیسے کر سکتے ہیں؟

- اپنے احباب کو طلوعِ اسلام کا خریدار بنایئے۔
- اپنے شہر میں طلوعِ اسلام کی ایجنسی قائم کیجئے۔
- کسی مقامی ایجنٹ کو تیار کیجئے کہ وہ طلوعِ اسلام کا لٹریچر منگائے۔

ممکن ہو تو اپنے علاقے سے طلوعِ اسلام کے لئے اشتہار مہیا کیجئے۔

اسلام کی سرگزشت

آج کی صحبت میں گزشتہ اشاعت کے تسلسل میں عربوں میں یہودیت اور نصرانیت کے فروغ پر بحث کی گئی ہے۔ اس سے پہلی قسطوں میں جزیرۂ عرب، قبائل عرب اور عربوں کے دیگر ممالک و اقوام کے ساتھ تجارتی تعلقات کا تذکرہ آچکا ہے۔

ایک تو خود یہودیوں کا اس طرف میلان تھا کہ وہ اپنے دینی معتقدات اور مغربی علوم میں جو یونانی علوم سے کافی متاثر تھے ـــ تطبیق دینے کے بہت شائق تھے۔ دوسرے وہ منکرین مغرب جنہوں نے اپنے نظریات کی بنیاد یونانی فلسفہ پر رکھی تھی وہ بھی چاہتے تھے کہ اپنے فلسفی اعتقادات اور خالص دینی نظریات میں جو ان کے ہاں شریعت سے پہنچے تھے، باہمی تطبیق کی کوشش کریں کسی جہت سے بھی غور کیا جائے، اس کے نتیجہ میں ہمیں ایک ایسا دینی فلسفہ نظر آنے لگتا ہے، جو نہ خالص فلسفہ ہے اور نہ خالص دین ہے۔ یہودیت جب عرب میں آئی، تو اپنے جلو میں وہ تمام چیزیں لے کر آئی ہو۔

نصرانیت | نصرانیت اس عہد میں بہت کنیسوں میں منقسم اور بہت سے فرقوں میں بٹ چکی تھی۔ ان میں سے جزیرۂ عرب میں عموماً دو بڑے فرقے آئے تھے۔ ایک نساطرہ اور دوسرے یعقوبیہ نسطوریہ فرقہ زیادہ تر حیرہ میں پھیلا ہوا تھا اور یعقوبیہ فرقہ غسان اور دیگر شامی قبائل میں، ایسے ہی ان کے کچھ حصے اور گروہ وادی القریٰ میں بھی موجود تھے۔ جزیرۂ عرب میں نصرانیت کا اہم ترین مرکز نجران تھا، جو ایک سرسبز و شاداب اور خوب آباد شہر تھا۔ یہاں زراعت ہوتی تھی، اور ریشمی کپڑے بنے جاتے تھے۔ یہاں کھالوں کی تجارتی منڈی اور اسلحہ سازی کے کارخانے بھی تھے، یہ ان شہروں میں سے ایک تھا۔ جہاں کے یمنی خلّوں کے گیت عموماً تمام شعراء نے گائے ہیں۔ یہ شہر اس تجارتی راستے سے قریب واقع تھا جو حیرہ تک جاتا تھا، اس شہر کے معاملات عموماً تین رئیسوں کے ہاتھ میں رہتے تھے، سید، عاقب اور اسقف بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ سید کی خصوصیت وہی ہوتی تھی جو قبائل کے رؤسا کی ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ جنگ میں ان کا امیر اور کمانڈر ہوتا تھا اور خارجہ معاملات کی دیکھ بھال بھی وہی کرتا تھا۔ وہی اپنے قبیلہ اور دیگر قبائل کے باہمی تعلقات کی نگرانی کرتا تھا۔ اور عاقب دنیوی داخلہ امور کی نگرانی کرتا تھا۔ اور اسقف دینی امور کا نگران ہوتا تھا۔ اہم معاملات میں یہ تینوں باہمی مشورے سے فیصلہ کرتے تھے۔ یاقوت نے معجم میں لکھا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو نجران کا وفد آیا تھا۔ اس میں ایک سید تھا جس کا نام وہب تھا اور ایک عاقب تھا جس کا نام عبدالمسیح تھا اور ایک اسقف تھا جس کا نام ابوحارثہ تھا۔ رسول اللہ صلعم نے ان سے مباہلہ کرنا چاہا جس کے لئے وہ تیار نہیں ہوئے اور انھوں نے آپ سے صلح کرلی۔ چنانچہ آپ نے ان کے لئے ایک صلح نامہ لکھوا دیا تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہونے تو اسی صلحنامہ کے مطابق عمل کرتے رہے لیکن جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے ان کو جلاوطن کردیا، اور ان کی جائداد و اموال کی قیمت ان کو عطا کردی تھی۔

نجران میں ایک کعبہ تھا۔ یاقوت کا بیان ہے کہ اس کعبۂ نجران کو ـــ بیعہ دگرجا ـــ کہتے تھے۔ اسے عبدالمدان بن الدیان حارثی کی اولاد نے کعبہ کی تعمیر کے مطابق بنایا تھا۔ اور وہ لوگ کعبہ کے مقابلہ میں اس کی ایسی ہی تعظیم کرتے تھے اور اسے کعبۂ نجران کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اس میں کئی اسقف رہتے تھے جو سروں پر عمامے باندھتے تھے۔ بعض محققین نے کھوج لگایا کہ نصرانیت کے یہاں آنے سے پہلے یہ خود عربوں کا ایک کعبہ تھا جس کا وہ حج بھی کیا کرتے تھے، بعد میں نصاریٰ نے اس کو نجران میں نصرانیت پھیل جانے کے بعد اپنے گرجا میں تبدیل کرلیا تھا۔ نجران کے نصاریٰ ـــ جیسا کہ اولیری نے کھوج نکالا ہے ـــ یعقوبیہ فرقہ کے پیرو تھے۔ رومیوں کے ساتھ اتصال کی بہ نسبت حبشہ کے ساتھ ان کے ارتباط کی یہی وجہ تھی (کیونکہ حبشی بھی یعقوبیہ فرقہ ہی سے تعلق رکھتے تھے)

عربوں میں اسلام سے پہلے ان کے رؤسا میں سے قس بن ساعدہ مشہور ترین رئیس گذرا ہے، عرب کے ادباء نے بیان کیا ہے کہ وہ نجران کا اسقف تھا۔ لیکن "لامانس" نے ـــ یزید کی ردا سے اپنی کتاب میں اس بیان کے غلط ہونے کا قطعی یقین دلایا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ قس بن ساعدہ کا نجران والوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

ذونواس نے اہل نجران پر حملہ کرکے انھیں قتل کردیا ـــ جیسا کہ ہم یہودیت پر بحث کرتے ہوئے پہلے بیان کرچکے ہیں ـــ بعض مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ قرآن کریم کی یہ آیت اسی واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ مگر یہ تفسیر بعید معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ یہود و نصاریٰ سب ہی اللہ عزیز و حمید پر ایمان رکھتے تھے نصاریٰ نے حبشہ سے مدد مانگی تھی، اور انھوں نے ان کی مدد کی تھی انھوں نے بلاد عرب پر ۵۲۳ء میں حملہ کیا۔ اور ذونواس کو شکست دی اور بحر احمر کے کنارہ پر ایک حبشی نوآبادی قائم کردی گئی تھی۔ یہاں پر یہ لوگ حکومت کرتے رہے جہاں ۵۷۵ء تک ان کی حکومت قائم رہی

روزوں کے قرآنی احکام

(۱) قرآن کی رو سے روزے فرض ہیں۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (۲/۱۸۳)

(۲) روزوں کے دن متعین ہیں اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ (۲/۱۸۴)

(۳) یعنی ایک مہینہ بھر کے روزے۔ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (۲/۱۸۵)

(۴) کسی معاشرے میں افراد کی حالت یہی ہوسکتی ہے کہ

(ا) وہ سفر میں ہوں۔ حالت سفر میں روزہ ملتوی کیا جائے اور جب گھر پر آجائیں تو جتنے روزے چھوڑے ہوں وہ پورے کئے جائیں فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ (۲/۱۸۴)

(ب) گھر پر ہوں۔ لیکن بیمار ہوں۔ یہ بھی روزہ ملتوی کریں جب تک اس مرض سے شفایاب نہ ہوجائیں۔ شفایاب ہونے کی صورت میں وہ تمام روزے پورے کئے جائیں۔ جو چھوڑے ہوں۔ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا ... فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ (۲/۱۸۴)

(ج) گھر پر ہوں اور تندرست و توانا ہوں تو پورے مہینے کے روزے رکھے جائیں۔ جیسا کہ اوپر (۳) میں بتایا جاچکا ہے۔

(د) گھر پر ہوں لیکن حالت ایسی ہو کہ روزہ کو بمشقت برداشت کیا جائے۔ ایسے لوگوں پر روزہ فرض نہیں لیکن وہ ہر روزے کے بدلے کسی غریب کو کھانا دیدیں وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ (۲/۱۸۴) اگر حالت بین بین ہو تو روزہ رکھنا بہتر ہے وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ (۲/۱۸۴)

(س) روزوں کے معاملہ میں اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے۔ سختی نہیں برتنا چاہتا يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (۲/۱۸۵)

اسی لئے مذکورہ احکام دیئے ہیں۔

(۵) عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ کی تفسیر میں مصر کے علامہ عبدہ نے لکھا ہے

الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ سے مراد یہاں بوڑھے ضعیف لوگ اور وہ اپاہج آدمی جن کے امراض کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو نیز جو لوگ ان جیسے ہوں مثلاً مزدور پیشہ لوگ جن کی معاش خدا نے ہمیشہ پر مشقت کاموں میں رکھدی ہو جیسے کانوں سے کوئلہ نکالنے والے مزدور نیز ان میں وہ مجرم بھی داخل ہیں جن سے جیلوں میں پر مشقت کام لئے جاتے ہوں اور ان پر روزہ رکھنا گراں ہو۔ تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جن پر کسی ایسی وجہ سے جس کے دور ہونے کی امید ہو۔ روزہ رکھنا گراں گزرتا ہو جیسے بڑھاپا اور پیدائشی کمزوری اور ہمیشہ محنت کے کاموں میں مشغولیت اور پرانی بیماریاں جن کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو نیز وہ شخص جس کی مشقت کا سبب بار بار پیکر رہتا ہو جیسے حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت ان سب لوگوں کے لئے جائز ہے کہ وہ روزہ رکھنے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں اتنا کھانا جتنا کہ وہ درمیانی خوراک سے ایک آدمی کا پیٹ بھرتا ہے

تفسیر المنار (ج ۲ ص ۱۵۵-۱۵۶)

مشرقی پاکستان کے سیاسی عناصر

(کمیونسٹ)

ہندو اور کمیونسٹ

بنگال کے ہندوؤں نے تقسیم کو روکنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگادی۔ انھوں نے اپنی جیسی ہر ممکن کوشش کی۔ مگر ان کی خواہشوں اور تمناؤں کے علی الرغم جب پاکستان قائم ہو ہی گیا، تو انھوں نے کھلم کھلا پاکستان کی مخالفت کرنے کی بجائے ہر اس شر پسند، ہنگامہ پرور طبقے کی سرپرستی شروع کر دی جو پاکستان کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ان ہندوؤں نے اگر ایک طرف مولویوں کو خرید لیا تھا، تو دوسری طرف انھوں نے کمیونسٹوں کے سر پر ہاتھ رکھا۔ مولوی نے فی سبیل اللہ فساد کرانا شروع کیا اور کمیونسٹوں نے اپنے طور پر ملک میں تباہی اور انتشار پھیلانے کا پروگرام مرتب کیا۔

مشرقی بنگال کے عوام غربت و افلاس کا شکار تھے اس لئے ان میں کمیونزم کو بہت فروغ ہونا چاہیئے تھا۔ مگر اس میں انکی شدید مذہبیت آڑے آئی اور عوام کمیونسٹوں کے حملے سے بچ گئے۔ انھوں نے مشرقی بنگال کے عوام کو ورغلانے کی بڑی کوششیں کیں۔ مگر ان کو اس میں سخت ناکامی ہوئی۔

کمیونسٹوں کا مرکز

تقسیم کے بعد مشرقی بنگال کی سرحد کھلی ہوئی تھی اور آمد و رفت میں کسی قسم کی پابندی نہیں تھی۔ اس لئے کمیونسٹوں نے کلکتہ کو اپنا مرکز قرار دے کر مشرقی بنگال میں اپنی تحریک چلائی۔ سرحد کے کھلے ہوئے ہونے سے ان کمیونسٹوں کو یہ آسانی تھی کہ جب انھیں گرفتاری کا خطرہ محسوس ہوتا تھا یہ چپکے سے سرحد پار کر جاتے تھے۔ مشرقی بنگال کے ہندو ان کمیونسٹوں کے سرپرست تھے۔ ان کا سارا خرچ بھی برداشت کرتے تھے۔ کیونکہ یہ لوگ پاکستان کو ختم کرنے کی تخریبی مہم چلا رہے تھے۔

کمیونسٹوں نے ایک سال تک بڑی سرگرمی دکھائی۔ مگر ان کو اس میں کسی قسم کی کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مشرقی بنگال میں کارخانے وغیرہ تھے نہیں۔ جہاں وہ مزدوروں کے ہمدرد بن کر ان سے ہنگامے اور فساد کراتے۔ جب ان کو اپنی کامیابی کی کوئی صورت دکھائی نہ دی تو انھوں نے اپنا نقشۂ جنگ بدل دیا اور عوام کی بجائے اپنی توجہ طالب علموں کی طرف مبذول کی چنانچہ کمیونسٹوں کی بہت بڑی تعداد پورے مشرقی بنگال کے تعلیمی اداروں میں بڑی خاموشی کے ساتھ پھیل گئی۔

طلباء میں کمیونزم کی تبلیغ

مشرقی بنگال کے تقریباً تمام تعلیمی ادارے ہندوؤں کے قبضہ میں تھے، اس لئے کمیونسٹوں کو اپنے اس نئے پروگرام میں کامیابی کے امکانات بہت زیادہ دکھائی دیئے۔ پھر چونکہ یہ کمیونسٹ خود بھی ہندو تھے، اس لئے بھی ان کا کام بڑا آسان ہو گیا۔ اس مقصد کے لئے ہندو کمیونسٹوں نے تعلیمی اداروں کے ہندو سربراہوں، سرپرستوں اور اساتذہ سے مل کر منظم پروگرام بنایا اور اس کے مطابق کام شروع کیا۔ مسلمان طلباء میں کمیونزم کے اصولوں کی تبلیغ شروع کر دی۔ بدقسمتی سے بنگلہ زبان میں سرے سے اسلامی لٹریچر کا وجود ہی نہ تھا۔ اس لئے پرائمری اسکول سے لے کر ایم اے تک مسلمان طالب علموں کو ہندو مصنفین کی کتابیں پڑھنی پڑتی تھیں۔

علمائے کرام کو اپنی فی سبیل اللہ فساد کی مہم ہی سے فرصت نہ تھی کہ وہ اس طرف توجہ کرتے۔ ان کی اس بے توجہی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن پاک کا ترجمہ بنگلہ زبان میں سب سے پہلے ایک ہندو پروفیسر نے کیا۔ جو وہاں آج تک رائج ہے۔ مشرقی بنگال میں ہزاروں کی تعداد میں عربی مدارس تھے جہاں لاکھوں طالب علم علوم عربیہ کی تکمیل میں مصروف تھے لیکن عربی مدارس میں پڑھنے پڑھانے والوں تک نے ملک و قوم کے سامنے ایسا نمونہ پیش کیا تھا کہ اعلیٰ طبقہ نہ تو اپنے بچوں کو عربی مدارس میں داخل کرنا پسند کرتا تھا اور نہ ہی عربی مدارس سے فارغ ہونے والے طالب علموں کو اچھی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

ہندوؤں کی چالیں

تقسیم کے بعد جب ہندوؤں نے مجبور ہو کر اپنی درسگاہوں کے دروازے مسلمان طالب علموں کے لئے کھول دیئے۔ تو ان میں ہزاروں مسلمان طالب علم داخل ہو گئے۔ ہندو اساتذہ نے مسلمان طالب علموں کو غلط راستے پر ڈالنے کی جو خفیہ اسکیم تیار کی تھی اس کے پیش نظر انھوں نے مسلمان طالب علموں کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ کرنا شروع کیا۔ اور ان کی دل جوئی اور دلداری کے ساتھ ساتھ ان کو کمیونزم کے اصولوں کی تعلیم بھی دیتے رہے اور حکمراں طبقہ کے خلاف ان کے دلوں میں نفرت و حقارت کا جذبہ بھی پیدا کرتے رہے تاآنکہ مسلمان طالب علموں کے دلوں میں پاکستان اور حکومت پاکستان کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات راسخ ہو گئے اور جن طالب علموں کو سر سیدؒ، حالیؒ اور اقبالؒ بننا تھا۔ وہ لینن، اسٹالن اور مالنکوف کے در دل پر سجدہ ریز ہو گئے۔ اور ان کی نقل کرنے کو اپنی معراج سمجھنے لگے۔ پاکستان دشمن عناصر نے رفتہ رفتہ ایسا ماحول پیدا کر دیا کہ مسلمان طالب علموں نے پڑھنا لکھنا چھوڑ کر عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔

طلباء اور سیاستداں

طلباء میں سیاسی شعور کے بیدار ہوتے ہی میدان سیاست کے پٹے ہوئے مہرے اور شکست خوردہ مگر طالع آزما مسلمان لیڈروں نے اس سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اور انھوں نے طلباء کو اپنا آلۂ کار بنا کر اپنے لئے زمین ہموار کرنی شروع کر دی۔ آخر ایک دن ایسا بھی آ گیا کہ ایک طالع آزما لیڈر نے ۱۹۴۸ء میں بنگالی زبان کو ایک سرکاری زبان بنائے جانے کے سلسلہ میں طلباء کے ایک جلوس کی رہنمائی کی۔ ۱۹۴۸ء کے اس جلوس کے بعد مشرقی بنگال میں جو انتشار اور اختلال پیدا ہوا ہے اس کا دروازہ آج تک بند نہیں ہوا۔ اس کے بعد کم ہی ایسے دن گذرے ہیں جب وہاں یہ ہنگامہ و فساد کی آواز نہ سنائی دی ہو۔ ان سارے ہنگاموں اور فسادات میں طلباء ہی پیش پیش ہوتے ہیں۔

طلباء کو عملی سیاست میں الجھا کر کمیونسٹوں نے مقامی اور غیر مقامی اور بنگالی، بہاری اختلافات کو بھی ہوا دی۔ اور اس طرح انھوں نے بڑی خاموشی کے ساتھ پورے مشرقی بنگال کو ایک جہنم کدہ بنا کر رکھ دیا۔

نفرت و حقارت کی مہم

ایک طرف مشرقی بنگال میں باہر والوں کے خلاف نفرت و حقارت پھیلانے کی مہم تیزی سے چل رہی تھی۔ دوسری طرف باہر والے یہاں کارخانے کھولنے اور گھریلو صنعتیں وغیرہ کو ترقی دینے میں مصروف تھے۔ مشرقی بنگال میں صرف نام کے لئے چند کارخانے تھے وہ بھی ان مقامی ہندوؤں کے تھے جو ان کارخانوں اور ملوں کی ساری آمدنی بھارت کو منتقل کر کے پاکستان کی معاشیات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا رہے تھے۔ ہندو کارخانہ دار اور صنعت کار یہ نہیں چاہتے تھے کہ مشرقی بنگال میں کوئی ایسی صنعت قائم ہو جس پر براہ راست ان کا کنٹرول نہ ہو۔ انھوں نے ہر اس تجویز کی مخالفت کی اور ہر اس اسکیم کو ناکام بنانے کی سعی کی۔ جس سے مشرقی بنگال میں صنعت و حرفت کا قیام عمل میں آسکے۔

مسلمان کاشتکار اور ہندو تاجر

مشرقی بنگال میں دنیا میں سب سے زیادہ پٹ سن پیدا ہوتا ہے۔ اس پیداوار سے مشرقی بنگال والوں کو اتنی آمدنی ہو جاتی تھی جس سے وہ بری بھلی زندگی بسر کر لیتے تھے۔ پٹ سن کی کاشت تو مسلمان کرتے تھے مگر اس کے کاروبار پر سو فیصدی ہندو تاجروں کا قبضہ تھا۔ جو اسے مسلمان کاشتکاروں سے سستے داموں خرید کر کلکتہ کے کارخانہ داروں کے ہاتھوں منمانی قیمتوں پر فروخت کر دیتے تھے تقسیم سے پہلے بنگال میں سب سے زیادہ پٹ سن کے کارخانے تھے جو بنگال کی تقسیم کے بعد سارے کے سارے مغربی بنگال کے حصہ میں آگئے۔ مشرقی بنگال کے حصہ میں پٹ سن کا ایک کارخانہ بھی نہیں آیا۔ تقسیم کے بعد پاکستان آجانے والے مسلمان تاجروں نے اس کمی کو بہت بری طرح محسوس کیا۔ اور جلد سے جلد مشرقی بنگال میں پٹ سن کے کارخانے قائم کرنے کی کوششوں میں لگ گئے۔

خطرہ کا احساس

کلکتہ کے ہندو تاجروں اور کارخانہ داروں کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ اگر واقعی مشرقی بنگال میں پٹ سن کے کارخانے قائم ہو گئے۔ تو ان کے کارخانوں پر اس کا بہت برا اثر پڑے گا۔ اس لئے انھوں نے ایسی تدبیروں پر غور کرنا شروع کیا۔ جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹنے پائے۔ چنانچہ انھوں نے بھی ان کمیونسٹوں کی خدمات حاصل کیں جو خود ان کے سب سے بڑے دشمن تھے انھوں نے کمیونسٹوں کے سارے خرچ برداشت کرنے کی ذمہ داری لی اور ان کی بہت سی ٹولیوں کو مشرقی بنگال کے مختلف علاقوں میں ہنگامہ و فساد، لاقانونیت اور ہراس پھیلانے کے لئے بھیجا

چنانچہ کمیونسٹ سارے مشرقی بنگال میں پھیل گئے۔

کمیونسٹوں کا پہلا ہنگامہ

کمیونسٹوں کے ہنگامے اور فساد کی سب سے پہلی آواز راج شاہی کے ایک علاقہ ناچول میں سنائی دی۔ جہاں کمیونسٹوں نے کئی پاکستانی سپاہیوں کو زندہ دفن کر دیا تھا۔ اور اس کے بعد یہ کمیونسٹ سرحد پار کر کے کلکتہ پہونچ گئے تھے۔ ان کمیونسٹوں کی رہنمائی کلکتہ کی مشہور کمیونسٹ ورکر مس ایلا گھوش کر رہی تھی۔ یہ مشرقی بنگال کی رہنے والی تھی مگر اس کی سرگرمیوں کا مرکز کلکتہ تھا۔ نئی اسکیم کے مطابق ایلا گھوش کو مشرقی بنگال میں ہنگامہ و فساد کرانے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ یہ کلکتہ میں کئی مرتبہ پولیس کے ہاتھوں گرفتار بھی ہو چکی تھی۔ مگر یہ برابر بیماری کا بہانہ کر کے جیل سے باہر آجاتی تھی۔ راجشاہی کے دیہاتی علاقہ میں اس نے ہندو نوجوانوں اور سنتھالوں کی مدد سے راجشاہی کے ایک گاؤں ناچول میں ایک بہت بڑا ہنگامہ کرانا چاہتی تھی جس کی خبر اتفاق سے پولیس والوں کو ہو گئی تو پولیس کی ایک جمعیت وہاں پہنچ گئی۔ جس نے غیر قانونی مجمع کو منتشر ہو جانے کا حکم دیا

سپاہیوں کو زندہ دفن کر دیا گیا

ایلا گھوش نے سپاہیوں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اگر وہ اپنے ہتھیار اس کے پاس جمع کرا دیں تو وہ مجمع کو پر امن طریقے پر منتشر کر دے گی۔ سپاہی اس کی باتوں میں آگئے۔ اور انھوں نے اپنے ہتھیار اس کے حوالے کر دیئے۔ ہتھیار پر قبضہ کرنے کے بعد ایلا گھوش نے مجمع کو حکم دیا کہ ان سپاہیوں کو زندہ دفن کر دیا جائے چنانچہ تمام سپاہی بڑی بے دردی سے زندہ دفن کر دیئے گئے سپاہیوں کو زندہ دفن کرانے کے بعد ایلا گھوش وقتی طور پر ہی روپوش ہو گئی۔ اس واقعہ نے حکومت کے ایوان میں تہلکہ ڈال دیا۔ پورے صوبہ میں کمیونسٹوں کی سرگرمیوں کی تیزی سے چھان بین شروع ہو گئی، تو کمیونسٹ اپنی عادت کے مطابق کچھ تو زیر زمین چلے گئے اور باقی سرحد کے اس پار چلے گئے۔

ایلا گھوش کی گرفتاری

پاکستان کی خفیہ پولیس نے ایلا گھوش کو عین اس وقت گرفتار کر لیا۔ جب وہ سرحد پار کرنے والی تھی۔ گرفتاری کے بعد اس پر مقدمہ چلا اور اسے عدالت سے سزا ہو گئی۔ مشرقی بنگال میں کمیونسٹوں کو ایلا گھوش کی گرفتاری اور سزائے قید سے بڑی سخت تکلیف پہنچی انھوں نے سزا کے خلاف مختلف علاقوں میں جلسے کئے، اور حکومت سے ایلا گھوش کو چھوڑ دینے کا مطالبہ کیا۔ اسی زمانہ میں کمیونسٹوں نے بنگلہ میں ایک کتاب "ایلارانی" کے نام سے شائع کی۔ جس میں ایلا گھوش کو چاند بی بی اور رضیہ سلطانہ سے بھی بڑا درجہ دیا گیا تھا۔ اور اسے "بنگال کی قابل فخر بیٹی" قرار دیا گیا تھا۔ ایلا گھوش کی گرفتاری اور سزا کے بعد صوبہ میں کمیونسٹوں کی سرگرمیوں کا زور کچھ سرد پڑ گیا تھا۔ مگر طالبعلم برابر جلوس نکال کر اور جلسے کر کے اپنی زندگی کا ثبوت دیتے جا رہے تھے

حکومت کی خاموشی

لیکن چونکہ اس قسم کے جلسے اور جلوسوں کا حکومت کے انتظامی امور پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ اس لئے حکومت بھی خاموش تھی اور حکومت کی خاموشی کی وجہ یہ تھی کہ مشرقی بنگال کا حکمراں طبقہ خود لوٹ کھسوٹ میں مصروف تھا۔ زمام اقتدار سنبھالنے کے بعد ان لوگوں نے سوائے اپنا گھر بھرنے کے عوام کے مسائل پر کبھی کوئی توجہ ہی نہیں دی تھی۔ اس لئے پاکستان دشمن عناصر بالخصوص کمیونسٹوں کو حکومت کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کا کافی موقعہ ملا۔

خواجہ ناظم الدین کا دورہ

جب خواجہ ناظم الدین مرکز میں وزیر اعظم مقرر ہوئے تو انھوں نے مشرقی بنگال کا دورہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ وہ جنوری ۱۹۵۲ء میں ڈھاکہ تشریف لائے۔ اور ۲۶ر فروری ۵۲ء کو پلٹن میدان میں ایک زوردار تقریر کی۔ جس میں انھوں نے آٹے دال کا بھاؤ بتلاتے ہوئے سرکاری زبان کا مسئلہ بھی چھیڑ دیا۔

ناظم الدین صاحب تو تقریر کر کے کراچی تشریف لے گئے۔ مگر کمیونسٹوں اور پاکستان دشمن عناصر کو ایک شوشہ ہاتھ آگیا کہ خواجہ ناظم الدین صاحب کون ہوتے ہیں سرکاری زبان کا اعلان کرنے والے۔ چنانچہ ان کی پلٹن میدان والی تقریر کو بہانہ بنا کر کمیونسٹوں نے پورے صوبہ میں لاقانونیت سی پیدا کر دی۔

نورالامین کی منافقت

صوبہ کے وزیر اعلیٰ مسٹر نورالامین بھی بنگلہ کو سرکاری زبان بنائے جانے کے حق میں تھے۔ مگر ان میں اتنی جرأت نہ تھی کہ کھل کر اس کا اظہار کرتے کیونکہ مرکزی حکومت کی یہ خواہش تھی کہ اردو ہی کو سرکاری زبان بنایا جائے۔

۲۱ر فروری ۵۲ء کو طلبا نے کمیونسٹوں کی راہ نمائی میں بنگلہ کو سرکاری زبان بنائے جانے کے لئے ڈھاکہ میں ایک جلوس نکالا۔ نورالامین صاحب نے بڑی خوبصورتی سے اس جلوس پر گولیاں بھی چلوا دیں۔ اور پھر خود ہی مشرقی بنگال کی اسمبلی سے بنگلہ کو سرکاری زبان بنائے جانے کی تجویز بھی منظور کرالی۔ اس طرح اپنے جانتے انھوں نے عوام اور طلباء میں سرخروئی حاصل کرنے کی ایک صورت نکال لی۔ مگر ان کی اس حرکت پر نہ تو طلباء نے خوشنودی کا اظہار کیا۔ اور نہ ہی عوام نے ان کے اس فعل کو پسند کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نورالامین صاحب کی یہ اسکیم اس بری طرح ناکام ہوئی کہ پچھلے الیکشن میں ان کو ایک طالبعلم کے ہاتھوں شکست اٹھانی پڑی۔ نورالامین صاحب کی حماقت سے ۲۱ر فروری ۵۲ء کے بعد مشرقی بنگال میں جو لاقانونیت اور سراج کا دور دورہ شروع ہوا ہے اس نے نہ صرف مشرقی بنگال کے خرمن امن کو خاکستر کر دیا۔ بلکہ اس نے مرکز کی چولیں بھی ہلا کر رکھ دیں۔

صنعتی ترقی کی ابتداء

سنہ ۱۹۵۲ء تک صوبہ میں کئی کارخانے تکمیلی مراحل طے کر چکے تھے جن میں آدم جی جوٹ مل اور کرنافلی پیپر مل خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں کارخانوں کے قائم ہو جانے سے ہندوستان کی مارکیٹ پر خاص طور سے زد پڑتی کیونکہ ان کے قیام سے پہلے کروڑوں روپے کا کاغذ اور پٹ سن کی بنی ہوئی چیزیں ہندوستان سے درآمد کی جاتی تھیں۔ اس سے ہندوستان کے تاجروں میں کھلبلی مچ گئی انھوں نے دوبارہ سینکڑوں کرائے کے کمیونسٹوں کو مشرقی بنگال میں ہنگامہ فساد کرانے کے لئے بھیج دیا۔ ان میں کا ایک طبقہ سادگی و پرکاری سے کارخانوں اور ملوں میں مزدور کی حیثیت سے بھرتی ہو گیا۔ اور دوسرا طبقہ اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

کارخانے اور صنعتی ادارے چونکہ نئے نئے قائم ہوئے تھے اس لئے وہاں ان کی دال فوری طور پر نہیں گلی۔ لیکن تعلیمی اداروں میں چونکہ کئی برسوں سے منظم طور پر کام ہو رہا تھا۔ اس لئے یہ کمیونسٹ طلباء کو آسانی کے ساتھ تخریب پسندی پر آمادہ کر سکے۔

مرکز گریز رجحانات

۲۱ر فروری کا ہنگامہ ابھی تازہ ہی تھا۔ اس لئے انھوں نے اس ہنگامہ کو بنیاد قرار دے کر صوبائی اور مرکزی حکومت کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا کچھ دنوں تک صوبائی حکومت کی بے تدبیری اور ناکارکردگی موضوع بحث رہی۔ لیکن چند ہی دنوں کے بعد سارا زور مرکز گریز رجحانات پر صرف ہونے لگا۔ کمیونسٹوں نے یہ بات پورے صوبے میں پھیلا دی کہ "مشرقی بنگال کی غربت اور افلاس کی ساری ذمہ داری مرکز پر ہے۔ اس لئے کہ مشرقی بنگال کا سارا روپیہ مرکز میں چلا گیا ہے۔ اور وہاں سے مغربی پاکستان کے دوسرے علاقوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ یہ اور اس قسم کے پروپیگنڈہ کا اثر تھا ہی کہ مشرقی پاکستان عوامی مسلم لیگ کے صدر مولانا عبدالحمید خاں بھاشانی طالب علموں کے لیڈر بن کر میدان میں آگئے۔ یہ صورت شکل سے تو تھے مولوی لیکن خیالات کے اعتبار سے ان کی رگ رگ میں کمیونزم بھرا ہوا تھا۔ ۲۱ر فروری کے ہنگامہ کے سلسلہ میں ان کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی تھی کیونکہ نورالامین صاحب کی مسلم لیگی وزارت نے ۲۱ر فروری کے ہنگامہ کے بعد ان کو بھی گرفتار کر لیا تھا۔ ان کی رہائی تقریباً ایک سال بعد عین اس وقت ہوئی جب صوبہ میں الیکشن کی تاریخوں کا اعلان ہو چکا تھا۔ الیکشن کی تاریخوں کے اعلان سے پہلے پورے صوبہ میں سوائے عوامی مسلم لیگ کے اور کوئی حزب اختلاف موجود نہیں تھی۔

الیکشنی جماعتیں

لیکن الیکشن کی تاریخوں کا اعلان ہوتے ہی کرشک سرمک پارٹی، ربانی لیگ، خلافت ربانی پارٹی اور نظام اسلام پارٹی بھی برساتی کیڑوں کی طرح نہ جانے کہاں سے آدھمکیں ان میں سے ہر پارٹی کے پاس اپنا لائحہ عمل اور اپنا خصوصی پروگرام تھا۔ مگر ان تمام برساتی جماعتوں میں صرف ایک چیز مشترک تھی اور وہ چیز تھی "مسلم لیگ دشمنی" چنانچہ باوجود ایک دوسرے سے بنیادی اختلافات کے یہ ساری جماعتیں ایک پلیٹ فارم پر اس لئے جمع ہو گئی تھیں کہ جس طرح سے بھی ہو مسلم لیگ کا خاتمہ کر دیا جائے

جگتو فرنٹ کا قیام

اس نئے پلیٹ فارم کا نام "جگتو فرنٹ" یا "متحدہ محاذ" رکھا گیا۔ یہ جماعت تحسبہم جمیعاً و قلوبہم شتّٰی کی زندہ مثال تھی۔

جگتو فرنٹ میں یوں تو بھانت بھانت کے لوگ شریک تھے مگر اس میں کمیونسٹ یا کمیونسٹ زدہ طلباء کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ ان کمیونسٹوں اور کمیونسٹ زدہ طلباء نے محض سیدھے سادے عوام کی ہمدردیاں یا ووٹ حاصل کرنے کے لئے موجودہ بھاشانی کو آگے بڑھایا۔ انھوں نے ہر روز مولانا سے تین تین چار چار بیانات دلوانے شروع کر دیئے۔ جو ایک طرف اگر حکومت کے خلاف ہوتے تھے۔ تو دوسری طرف ان سے مقامی غیر مقامی اور بہاری بنگالی کے فتنے کو شہ ملتی۔

مولانا بھاشانی کمیونسٹوں کے نقش قدم پر

الیکشن جوں جوں قریب آتا گیا مولانا کے بیانات میں اور سختی آتی گئی۔ یہاں تک کہ کمیونسٹوں نے مولانا کے دستخط کی ایک

بھڑ کوائی۔ اور انھوں نے جس قسم کا بیان بھی مناسب سمجھا مولانا کے نام سے شائع کرادیا۔ ان بیانات نے مقامی لوگوں کو باہر والوں کی جان کا دشمن بنادیا۔ اس کے ساتھ ساتھ کمیونسٹوں کا وہ طبقہ جو کارخانوں اور صنعتی اداروں میں گھس گیا تھا۔ وہ مزدوروں کو باہر والوں کے خلاف بھڑکاتا رہا اور ان کو اس پر اکساتا رہا کہ اگر وہ باہر والوں کو مار بھگانے میں کامیاب ہوگئے۔ تو پھر سارے کارخانے ملیں اور کاروبار وغیرہ ان کے اپنے قبضے میں آجائیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ صوبے کے تمام سرکاری اور غیر سرکاری عہدوں پر بھی ان کا تصرف ہو جائے گا۔

کمیونسٹ اور مقامی صحافت

کمیونسٹوں کے اس قسم کے پروپیگنڈوں کو مقامی بنگلہ صحافت سے بھی بہت مدد ملی۔ یہ اخبارات بنگلہ میں چھپتے تھے جن کے مندرجات کا باہر والوں کو بنگلہ کی ناواقفیت کی وجہ سے علم ہی نہیں ہوتا تھا۔ ان کو اس کا پتہ ہی نہیں تھا کہ اندر ہی اندر ان کے خلاف کس قسم کی کھچڑی پک رہی ہے۔ بنگلہ اخبارات نے بنگلہ زبان کی حمایت کی آڑ لے کر باہر والوں اور مرکز کے خلاف خوب خوب پروپیگنڈہ کیا جب ہر طرح سے مقامی لوگوں کے جذبات برانگیختہ ہوگئے۔ تو کمیونسٹوں نے اپنا سب سے پہلا نشانہ کرنافلی پیپر مل کو بنایا۔ جہاں انھوں نے اندر ہی اندر مقامی مسلمانوں کو باہر کے مسلمانوں کے خلاف اس قدر بھڑکایا کہ آخر کار وہاں وہ تاریخی فساد رونما ہوا۔ جس نے پورے پاکستان میں صفِ ماتم بچھادی۔

کرنافلی کا فساد

کرنافلی کے فساد میں چن چن کے ایسے لوگوں کو قتل کیا گیا جو فن کاغذ سازی میں اپنی مثال آپ تھے۔ اور ان میں سے بعض تو بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے۔ کرنافلی پیپر مل کے فساد سے پہلے اس علاقہ میں کپتائی کے مقام پر بھی کمیونسٹوں نے ایک زبردست فساد کرایا تھا۔ مگر اس وقت کی مسلم لیگی حکومت نے اس فساد کی خبر کو غلط افواہ کا نام دے کر دبا دیا تھا۔ کرنافلی پیپر مل کے فساد کا بھی شاید یہی حال ہوتا۔ اگر ڈھاکہ کے انگریزی روزنامہ "مارننگ نیوز" اس حادثہ کا انکشاف نہ کرتا۔ جس وقت کرنافلی کے خونین حادثہ کی خبر مارننگ نیوز میں شائع ہوئی ہے۔ اس وقت مولوی فضل الحق وزارت کا حلف اٹھانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ چنانچہ جس روز کرنافلی پیپر مل کے مقتولین کی لاشیں ڈھاکہ لائی گئی ہیں۔ اس روز فضل الحق صاحب نے وزیر اعلیٰ کے عہدہ کا حلف اٹھایا تھا۔ یہ کس قدر عبرتناک منظر تھا کہ گورنمنٹ ہاؤس میں فضل الحق صاحب وزارت عظمیٰ کا حلف اٹھا رہے تھے اور دوسری طرف اس شہر میں کرنافلی کے منتظم اعلیٰ خورشید علی مرحوم اور ان کے ساتھیوں کو سپرد خاک کیا جا رہا تھا۔

سیاسی نظر بندوں کی رہائی

الیکشن چونکہ کمیونسٹوں کی مدد سے جیتا گیا تھا۔ اس لئے فضل الحق صاحب کے حلف وفاداری اٹھاتے ہی کمیونسٹوں نے ان سے مطالبہ کیا کہ صوبے کے سیاسی نظر بندوں کو رہا کر دیا جائے انھوں نے کمیونسٹوں کا یہ مطالبہ حلف اٹھانے سے پہلے ہی تسلیم کر لیا تھا۔ چنانچہ حلف وفاداری کی رسم کے بعد وہ گورنمنٹ ہاؤس سے سیدھے سکریٹریٹ پہونچے اور اپنے قلم سے سب سے پہلا حکم سیاسی نظر بندوں کی رہائی کا دیا۔ ان سیاسی نظر بندوں میں اکثریت ان کمیونسٹوں کی تھی۔ جن کو مختلف موقعوں پر صوبائی حکومت نے گرفتار کیا تھا۔ ان سیاسی نظر بندوں یا کمیونسٹوں کی رہائی پر بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ جلسے کئے گئے، اور جلوس نکالا گیا۔ ان کی رہائی سے کمیونسٹوں کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے۔

ایلاگھوش کی رہائی کا مطالبہ

اور انھوں نے سزا یافتہ کمیونسٹوں کی رہائی کے مطالبات بھی شروع کر دیئے۔ ان میں ایلاگھوش کی رہائی کا مطالبہ بھی شامل تھا۔ ایلاگھوش نے اپنی پرانی عادت کے مطابق بیماری کا ڈھونگ رچایا۔ جیلخانے میں اس پر بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے تو اسے علاج کے لئے ڈھاکہ میڈیکل کالج میں داخل کر دیا گیا۔ جہاں اسے ایک ایسے وارڈ میں رکھا گیا جس میں سیکڑوں مریض زیر علاج تھے۔ ایلاگھوش کے میڈیکل کالج میں داخل ہو جانے کے بعد مریضوں کا یہ وارڈ گویا کمیونسٹوں کا صدر دفتر بن گیا۔ جہاں صوبے بھر کے کمیونسٹوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ایلاگھوش گھنٹوں کمیونسٹوں سے باتیں کرتی اور ان کو ہدایتیں دیتی۔ میڈیکل کالج کا کوئی ڈاکٹر یا افسر جب اس کے پاس آتا تو وہ بیہوش ہو جاتی۔ اور اس پر دورے پڑنے شروع ہو جاتے۔

متحدہ محاذ کی وزارت چونکہ قائم ہو چکی تھی۔ اس لئے کسی شخص کی یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ ایلاگھوش کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکالتا۔ کیونکہ ایلاگھوش تو بنگال کی قابل فخر بیٹی تھی اور اسے ایلا رانی کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ عوام کے سامنے وہ بنگال کی محسنہ اور ریفارمر کی حیثیت سے پیش کی جا رہی تھی۔

وزراء اور ایلاگھوش

مولوی فضل الحق کی وزارت کے قیام کو چند ہی دن گزرے تھے کہ کمیونسٹوں نے منظم طور پر ایلاگھوش کی شدید بیماری کا بہانہ کر کے اس کی رہائی کا مطالبہ شروع کر دیا۔ اس کے لئے ہر شہر اور ہر گاؤں میں جلسے ہونے شروع ہوگئے اور وزراء پر زور دیا جانے لگا کہ وہ خود اپنی آنکھوں سے ایلاگھوش کا حال معلوم کریں چنانچہ فضل الحق کابینہ کے دو وزیر آبو حسین سرکار اور عزیز الحق عرف نانا میاں بہ نفس نفیس میڈیکل کالج گئے۔

ڈھاکہ جیل کا ہنگامہ

طلباء نے متحدہ محاذ کی وزارت پر زور دیا کہ وہ جلد سے جلد ایلاگھوش کو رہا کرے یہ مطالبہ کافی زور پکڑ چکا تھا کہ ڈھاکہ جیل کا ہنگامہ ہو گیا۔ جس میں جیل کے وارڈنوں اور عوام کے ایک گروہ میں تصادم ہو گیا۔ اس ہنگامے کی سب سے دلچسپ چیز یہ تھی۔ کہ فضل الحق کابینہ کے ایک وزیر ہنگامہ کرنے والوں کی راہنمائی کر رہے تھے۔ اس ہنگامہ کے زمانہ میں ہی فضل الحق صاحب نے ایلاگھوش کی پیرول پر رہائی کے احکام جاری کر دیئے، چنانچہ وہ علاج کے لئے کلکتہ چلی گئی۔ اس کے کلکتہ جانے کے بعد کمیونسٹوں نے اپنی تخریب پسندی کی مہم پہلے سے زیادہ تیز کر دی۔

کمیونسٹ اور آدم جی جوٹ مل

کرنافلی پیپر مل کے فساد کے بعد انھوں نے اپنی ساری توجہ دنیا کے سب سے بڑے جوٹ مل "آدم جوٹ مل" کی طرف مبذول کر دی تھی۔ اس مل کے وجود میں آجانے سے کلکتہ کی ملوں پر بہت برا اثر پڑا تھا۔ کیونکہ اب پاکستان کی ضروریات کی ساری چیزیں خود اسی مل میں تیار ہونے لگی تھی۔ یہی نہیں بلکہ پٹ سن کی بنی ہوئی چیزیں پاکستان سے باہر بھیجنے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں (جیسا کہ پہلا کہا جا چکا ہے) کلکتہ اور مشرقی بنگال کے ہندو اس صورت حال سے بہت پریشان تھے۔ ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ جلد سے جلد مشرقی بنگال کی صنعتی ترقی بند ہو جائے۔ تاکہ وہ پہلے کی طرح زیادہ غیر ملکی زرمبادلہ حاصل کر سکیں۔ مشرقی بنگال میں ہنگامہ وفساد اور افراتفری پیدا کرنے ہی کے لئے وہ کمیونسٹوں اور تخریب پسندوں کی سرپرستی کر رہے تھے۔

آدم جی جوٹ مل کا فساد

چنانچہ کلکتہ اور مقامی ہندوؤں کے اشاروں پر آدم جی جوٹ مل میں رمضان کے مہینے میں وہ ہولناک فساد کرا دیا گیا کہ جس میں پانچسو سے زیادہ آدمی مارے گئے۔ اس خونین حادثہ نے نہ صرف پاکستان بلکہ بیرون ملک میں بھی تہلکہ مچا دیا۔ آدم جی جوٹ مل کا ہنگامہ بلاشبہ کمیونسٹوں کی سب سے بڑی فتح تھی۔

فضل الحق کی برطرفی

انھوں نے بزعم خویش مشرقی بنگال کو تباہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ لیکن غنیمت ہوا کہ اس کے بعد یہ منحوس وزارت برطرف کر دی گئی۔ مولوی فضل الحق کی برطرفی کے بعد میجر جنرل اسکندر مرزا کو صوبے کا گورنر مقرر کیا گیا۔ انھوں نے حکومت سنبھالتے ہی بڑی جرات سے کام لے کر کمیونسٹ پارٹی کو غیر قانونی جماعت قرار دیا۔ اور ان کی گرفتاریاں شروع کر دیں۔ میجر جنرل اسکندر مرزا کے اس اقدام سے کمیونسٹوں کی ان برملا تخریبی کارروائیوں کا زور ٹھنڈا ہو گیا۔

ہنگامے صرف مسلمانوں کے کارخانوں میں ہوئے

یہاں پر یہ بات دلچسپی سے سنی جائے گی کہ مشرقی بنگال کے صنعتی اداروں اور کارخانوں میں بیسیوں مرتبہ فسادات ہوئے ہڑتالیں ہوئیں، ہنگامے ہوئے۔ لیکن ہندوؤں کے کارخانوں میں آج تک ایک دن کے لئے بھی کام بند نہیں ہوا۔ عام لوگوں کو اس پر سخت تعجب ہے کہ آخر کمیونسٹوں کے حملوں کا نشانہ مسلمان تاجر صنعت کار۔ اور کارخانہ دار ہی کیوں ہیں؟ اہل نظر جانتے ہیں کہ یہ ہندو کارخانہ دار اور سرمایہ دار ہیں۔ جن کے اشاروں پر کمیونسٹ ہنگامہ وفساد کرتے رہتے ہیں اور یہی ہیں جو اب تک مشرقی پاکستان سے کروڑوں روپے بھارت کو منتقل کر چکے ہیں اور آج بھی اس منفعت بخش کاروبار میں مشغول ہیں۔ یہ کاروبار اس وقت تک جاری رہے گا۔ جب تک یہ مشرقی بنگال کو خدانخواستہ تباہی کے آخری دروازے تک نہ پہونچا دیں گے

قرآنی تعلیم کی ضرورت

تصریحات بالا سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آگئی ہوگی۔ کہ اگر مرکزی حکومت یہ چاہتی ہے کہ مشرقی بنگال میں پائیدار بنیادوں پر امن و امان قائم ہو جائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسے اقدامات کرے جن سے طلباء کے ذہن سے کمیونزم کے جراثیم نکل جائیں۔ [illegible] اور اس کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں کہ تعلیم کی درسگاہوں میں صحیح قرآنی تعلیم شروع کر دی جائے۔ جب تک نوجوان طالب علموں کے قلب ودماغ کی تعمیر صحیح خطوط پر نہ ہوگی۔ وہ

عرفانِ الٰہی

ماہنامہ "ثقافت" (لاہور) نے اپنی مارچ کی اشاعت میں لکھا تھا کہ

> انسان کے لئے اہم ترین علم اپنی حقیقت کا عرفان ہے اور دین کا مقصود آخری اور غایت عرفان خدا کا عرفان ہے۔

اس پر ہم نے (ایک مستفسر کے جواب میں) ۱۹ مارچ کے طلوع اسلام میں لکھا تھا کہ

(۱) قرآن خدا کی ذات پر ایمان کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کے عرفان کا نہیں۔ خدا اس سے بہت بلند ہے کہ انسان اس کی ذات کی حقیقت (ماہیت) جان اور پہچان سکے۔ لہٰذا دین کا مقصود خدا کا عرفان نہیں۔

(۲) قرآن نفس انسانی کے عرفان کا بھی مطالبہ نہیں کرتا وہ نفس انسانی پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ جس طرح وہ کائناتی شواہد پر تدبر و فکر کی دعوت دیتا ہے، لیکن "معرفت" اور غور و فکر کے بعد کسی شے کے متعلق علم حاصل کرنے میں جو فرق ہے۔ وہ بالکل واضح ہے۔

"ثقافت" کی اپریل کی اشاعت میں ہمارے اس جواب پر تنقید (محترم سید جعفر شاہ صاحب پھلواروی نے اپنے نام سے) شائع کی ہے، اس میں انھوں نے (قرآن کی ان آیات کے حوالے سے جس میں نفس انسانی پر تدبر کی طرف توجہ دلائی گئی ہو) لکھا ہے کہ تدبر و تفکر کے ذریعے جو علم حاصل ہوتا ہے، اسے اور آگے بڑھا دیا جائے تو وہ عرفان کہلاتا ہے۔ چنانچہ اس کے لئے انھوں نے امام راغب کے لغت کے حوالے سے بتایا ہے کہ

> کسی چیز کی علامت پر تفکر و تدبر کرنے سے اس چیز کا جو کچھ ادراک ہوتا ہے۔ اسی کو معرفت یا عرفان کہتے ہیں۔ یہ علم سے اخص ہے اور اس کی ضد ہے انکار۔

ہم محترم شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ کسی چیز پر تدبر و تفکر سے جو علم حاصل ہوتا ہے: اگر اسی کی اخص شکل کا نام "عرفان" ہے تو ہمیں اس طرح کے عرفان نفس (یعنی علم النفس) پر کوئی اعتراض نہیں۔ یہ چیز تو ہم نے خود ہی لکھ دی تھی۔ کہ قرآن نفس انسانی پر تدبر و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ ہم نے لکھا یہ تھا کہ

"معرفت" [illegible] غور و فکر کے بعد کسی شے کے متعلق [illegible]

[illegible]

سے اس کے متعلق علم حاصل کیا جائے۔ اس کو ادراک بھی کہتے ہیں اس کے برعکس اہل تصوف کا یہ دعویٰ ہے کہ تدبر و تفکر سے کسی شے کی حقیقت کے متعلق علم حقیقی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کا ایک اور ہی ذریعہ ہے جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ علم براہ راست (DIRECTLY) حاصل ہوتا ہے۔ اس سے اس شے کی حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آ جاتی ہے اسے "معرفت" یا "عرفان" کہتے ہیں

ہم نے لکھا یہ تھا کہ نفس انسانی کے متعلق قرآن غور و فکر کے ذریعہ علم حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہے "معرفت" یا "عرفان" کا حکم نہیں دیتا۔ یہ تصوف کی تعلیم ہے، جسے قرآن سے کوئی واسطہ نہیں، اسے ہم پھر دہراتے ہیں کہ قرآن کی رو سے حقیقت یہ ہے براہ راست (DIRECT) علم صرف وحی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ جو نبی کے لئے مخصوص ہے غیر نبی کے لئے علم کا ذریعہ تدبر و تفکر ہی ہے۔ تدبر و تفکر کے ذریعہ حاصل کردہ علم کو اگر آپ معرفت یا عرفان کہنا چاہتے ہیں تو اس پر ہمارا جھگڑا نہیں لیکن اگر آپ اس علم کی سند جسے تصوف کی اصطلاح میں "عرفان" یا "معرفت" کہا جاتا ہے۔ قرآن سے لانا چاہیں گے تو اس میں آپ کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ قرآن نے وہ وحی کہا ہے جو انبیا کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔ یہ تو رہا "عرفان نفس" کے متعلق۔ باقی رہا "عرفان خداوندی" یا "معرفت ذات الٰہی" سو اس کے متعلق عرض ہے کہ اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ اشیائے کائنات پر غور و فکر سے انسان اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ کائنات کے پیچھے کوئی ایسی ہستی ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے اور جو اسے اس حسن و زیبائی سے چلا رہی ہے تو اس تدبر و فکر کی تائید قرآن کے ورق ورق سے ملتی ہے لیکن اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ ایک ایسا ذریعہ علم بھی ہے جس سے انسان ذات خداوندی کی حقیقت جان لیتا ہے (جسے تصوف میں "معرفت" کہتے ہیں) تو یہ تصور قرآن کے یکسر خلاف ہے، ذات خداوندی کی حقیقت انسانی علم کے دائرے سے بہت آگے اور بلند ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ ان تصریحات سے واضح ہو گیا ہوگا۔ کہ ہم نے اپنے بیان میں کیا کہا تھا۔

(۵) محترم شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ

> امام راغب تو آپ کے لئے حجت نہیں ہو سکے لیکن اقبال تو ضرور آپ کے لئے حجت ہوں گے

ہم یہ عرض کر دیں کہ ہمارے نزدیک نہ کوئی راغب حجت ہے۔ نہ اقبال، دین میں ہمارے لئے حجت صرف اللہ کی کتاب ہے۔ جس نے ہمیں دین عطا کیا ہے۔

(۶) مذکورہ صدر فقرہ کو محترم شاہ صاحب نے اس طرح مکمل کیا ہے

> اقبال تو آپ کے نزدیک ضرور حجت ہوں گے کیونکہ آپ کی کسی تحریر سے مجھے یہ علم نہ ہو سکا کہ اقبال میں بھی کوئی بشری کمزوری ہو سکتی ہے بہرحال اپنے اس "امام معصوم" کی زبان سے بھی کچھ سن لیجئے۔"

ہم محترم شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ اقبال کو ہم نے نہ کبھی "امام معصوم" کہا ہے، اور نہ ہی اسے بشری کمزوریوں سے مبرا تسلیم کیا ہے۔ باقی رہا یہ کہ شاہ صاحب کو ہماری کسی تحریر سے یہ علم نہ ہو سکا کہ اقبال میں بھی کوئی بشری کمزوری ہو سکتی ہے: تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ انھوں نے ۱۹ مارچ کے طلوع اسلام کے مضمون پر تنقید فرمائی ہے۔ اگر وہ (کم از کم) ۱۹ فروری کا طلوع اسلام کھول کر دیکھ لیتے تو اس کے صفحہ ۲ پر انھیں یہ عبارت نظر آ جاتی۔

> علامہ اقبال قرآنی تعلیم کے علمبردار تھے، اور اس باب میں انھوں نے جو قرآن کی خدمت کی ہے، اس پر ہمارا دور جس قدر بھی فخر کرے کم ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے ہاں بشریت کی خامیاں موجود ہیں۔ جس کا اظہار ان کے کلام میں بھی ہو جاتا ہے اور نجی خطوط میں بھی (اس کے بعد اس کی دو مثالیں پیش کر کے لکھا گیا ہے) ظاہر ہے کہ یہ (غالباً غیر شعوری طور پر) ان جذبات کا اظہار ہے۔ جو ان کے بچپن کی تعلیم اور ماحول کی وجہ سے ان کے تحت الشعور میں جاگزیں تھے، اور جنھیں شعوری تدبر و تفکر بھی جڑ سے نہیں نکال سکا تھا، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے راہ نمائی کے لئے صرف وحی کو سند قرار دیا ہے۔ نہ کہ کسی انسان کو۔ اس لئے کہ انسان خواہ کتنا ہی اونچا کیوں نہ ہو اپنے ماحول اور وراثتی اثرات سے غیر متاثر رہ نہیں سکتا

ہمیں امید ہے کہ محترم شاہ صاحب اب اس کا اعلان فرما دیں گے کہ طلوع اسلام میں ایسی تحریریں ہیں۔ جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ علامہ اقبال کو بشری کمزوریوں سے مبرا اور "امام معصوم" نہیں قرار دیتا۔

آخر میں ہم محترم شاہ صاحب کی خدمت میں نہایت ادب سے ضمناً گذارش کرنا چاہتے ہیں کہ یہ بات صحافتی آداب میں داخل ہے کہ اگر کسی مجلہ یا اخبار میں کوئی چیز بغیر کسی نام کے شائع ہو تو اس کے سلسلہ میں اس مجلہ یا اخبار کو مخاطب کیا کرتے ہیں، نہ کہ کسی خاص فرد کو۔ اور اگر کسی فرد کی طرف اشارہ کرنا لاینفک ہو جائے، تو اس کے مدیر کا نام لیا کرتے ہیں۔ کیونکہ اس میں جو کچھ بغیر نام کے شائع ہوتا ہے، اس کا ذمہ دار اور مسئول مدیر ہوتا ہے۔

انسان نے
اپنے معاشی مسئلہ
کا حل کیا سوچا؟ اور قرآن
اس کا کیا حل بتاتا ہے۔
اس کا جواب
نظامِ ربوبیت
میں دیکھئے
جو عنقریب شائع ہو رہی ہے

باب المراسلات

تاریخ کی اہمیت

کراچی سے ایک صاحب دریافت کرتے ہیں کہ (۱) کسی قوم کی زندگی میں تاریخ کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟ (۲) مسلمانوں کی تاریخ کس حد تک قابلِ اعتماد ہے؟ اور (۳) ہمارے ہاں تاریخ کی کون سی کتاب ایسی ہے جس کے مطالعہ کی ہم سفارش کرتے ہیں۔

طلوع اسلام قرآن کریم تاریخ اقوام کے مطالعہ پر بڑا زور دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے پیش کردہ حقائق کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے سامنے اس کے دور تک کا پورا علم اور اقوام سابقہ کے احوال و کوائف ہوں۔ ان اقوام کی تاریخ سے اس کے سامنے یہ حقیقت آ جائے گی کہ اگر کوئی قوم فلاں قسم کی روشِ زندگی اختیار کرے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا اور فلاں انداز کے مطابق چلے تو اس کا حاصل یہ ہے۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے اس نے خود اقوام گذشتہ کی تاریخی سرگذشتوں کو بار بار دہرایا ہے۔

یہ تو رہا دوسری قوموں کی تاریخ کے متعلق۔ جہاں تک کسی قوم کی اپنی تاریخ کا تعلق ہے۔ اقبال نے کہا ہے کہ اس کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسی ایک فرد کے لئے حافظہ کی حیثیت ہوتی ہے۔ اگر کسی شخص کا حافظہ جاتا رہے تو اس کی سابقہ شخصیت پوری کی پوری محو ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی قوم کی تاریخ گم ہو جائے تو اس کا قومی تشخص بھی ختم ہو جاتا ہے اور باقی صرف افسانے رہ جاتے ہیں۔ تاریخ ہی وہ رشتہ ہوتا ہے جس سے ایک دور کا انسان اپنے ماضی کے ساتھ وابستہ رہ سکتا ہے اگر یہ رشتہ منقطع ہو جائے تو ماضی کے ساتھ اس کا تعلق بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ایک قوم کی زندگی میں اس کی تاریخ کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن یہ اہمیت تاریخ کو حاصل ہوتی ہے افسانوں کو نہیں۔ اگر کسی قوم کی تاریخ باقی نہ رہے صرف افسانے رہ جائیں یا اس کی تاریخ میں افسانوں کی آمیزش ہو جائے۔ تو یہ چیز اس قوم کے حق میں نفع بخش ہونے کے بجائے ہلاکت آفریں بن جاتی ہے۔ اس قسم کی افسانوی تاریخ کا وجود اس کے عدم سے زیادہ نقصان رساں ہوتا ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ بہ حیثیت مجموعی چار ادوار پر تقسیم کی جا سکتی ہے۔ پہلا دور "محمد رسول اللہ والذین معہ" کا دور ہے۔ جس میں انہیں حکومت و مملکت ہی حاصل نہ تھی بلکہ نوعِ انسانی کے کاروانِ رشد و ہدایت کی قیادت بھی انہی کے حصے میں تھی۔ اس سے انہیں دنیا کی سرفرازیاں بھی حاصل تھیں اور آخرت کی خوشگواریاں بھی، پھر دوسرا دور وہ آیا جس میں ان کا قرآنی نظامِ زندگی ملوکیت میں بدل گیا۔ اب ان کے پاس دولت و قوت حشمت و ثروت، حکومت و مملکت تو پہلے سے بھی زیادہ تھی۔ لیکن یہ قوم انسانیت کی امامت کبریٰ کی وارث نہیں رہی تھی۔ اس سے اگلا دور وہ ہے جس میں ان کی قوت و دولت اور حکومت و مملکت پر بھی زوال آ گیا۔ اور رفتہ رفتہ یہ قوم پستی کی انتہا تک پہنچ گئی۔ اس کے بعد ان کی تاریخ کا چوتھا دور عصرِ حاضر کا دور ہے۔ جس میں ان کے عروقِ مردہ میں پھر سے زندگی کے آثار دکھائی دینے لگے ہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ شاید یہ پھر اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکیں، اس دور کے مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ معلوم کرے کہ قوم ان مراحل سے کس طرح گذری ہے اور ان تغیرات کے اسباب و علل کیا تھے۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ ان کے سامنے اپنی قوم کی صحیح اور قابلِ اعتماد تاریخ ہو۔

یوں تو ہر قوم کی تاریخ نویسی ایک مشکل فن ہے لیکن مسلمانوں کی تاریخ کی صورت میں یہ مشکل اور بھی بڑھ جاتی ہے اس لئے کہ تاریخ میں شخصیتیں بہرحال سامنے آئیں گی۔ اور تاریخی شخصیتوں کے متعلق حالت یہ ہے کہ ہماری بعض کے ساتھ عقیدت وابستہ ہے اور بعض کے خلاف جذبۂ عناد۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ ہماری تاریخ کی کتابیں جنبہ داری یا تعصب سے بمشکل محفوظ ہوں گی۔ اس کے علاوہ ان عناصر کو بھی سامنے رکھئے جو اسلام میں تخریب پیدا کرنے کے لئے مصروفِ عمل رہے ہیں (تفصیل ان امور کی ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "قرآنی فیصلے" میں دیکھئے)

اب رہا آپ کا یہ سوال کہ ہم تاریخ کی کتابوں میں سے کون سی کتاب کی سفارش کرتے ہیں سو اگر آپ کا مقصد یہ ہے کہ ہم تاریخ کی کوئی ایسی کتاب بتائیں جس پر بالکلیہ اعتماد کیا جا سکے تو معاف رکھئے ہم اس سے قاصر ہیں البتہ ان کتابوں میں علامہ اسلم جیراجپوری کی تاریخ الامت ایسی ہے جو فی الجملہ دوسری کتابوں کے مقابلہ میں زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔ یہ مختصر سی کتاب (آٹھ حصوں پر مشتمل ہے) لیکن آجکل نایاب ہے، ہم نے اس کی افادی حیثیت کے پیشِ نظر اسے (جنابِ مصنف کی اجازت سے) پاکستان میں شائع کرنے کا انتظام کیا ہے۔ چنانچہ اس کا پہلا حصہ (جو سیرۃ رسول اللہ پر مشتمل ہے) اس وقت پریس میں ہے۔ یہ تمام حصے یکے بعد دیگرے شائع ہوتے جائیں گے۔

جہاں تک دورِ رسالت اور عہدِ صحابہؓ کا تعلق ہے محفوظ ترین طریقہ یہ ہے کہ آپ ان کی تاریخ کو قرآن کریم کی روشنی میں مطالعہ کریں اور جو بات قرآن کے خلاف نظر آئے، اسے صحیح نہ سمجھیں۔ اس لئے کہ حضور نبی اکرمؐ اور آپ کے صحابہؓ قرآن پر عمل کرتے تھے۔ اس لئے ان کی سیرت کو قرآن کے مطابق ہونا چاہیئے۔

نقد و نظر

اردو کی نثری داستانیں

قوموں کی زندگی میں ان کے لٹریچر کو خاص مقام حاصل ہوتا ہے، لٹریچر وہ نبض ہوتی ہے جس پر انگلیاں رکھ کر اس قوم کی حرارت اور حرکت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، نبضوں ہی کی طرح لٹریچر کی بھی مختلف قسمیں ہوتی ہیں بعض ہیجانی بعض اعتدال پسند، بعض سکراتِ موت کی ہچکیوں کا آئینہ دار یہ چیز ایک حکیم الامت کے دیکھنے کی ہوتی ہے کہ قوم کی کس حالت میں کس قسم کے لٹریچر کے ابھارنے کی ضرورت ہے۔ لیکن حکیم الامت سے نیچے اتر کر دیکھئے۔ تو یہ کام بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے کہ قوم کے ہر طرح کے لٹریچر کو لیا جائے۔ اور اس کے متعلق چھان بین کی جائے۔ ہمارے ہاں انجمن ترقی اردو ایک ایسا ادارہ ہے جس نے اس مقصد کو اپنے سامنے رکھا ہے۔ زیرِ نظر کتاب اسی انجمن کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اور جہاں تک محنت اور تجسس کا تعلق ہے۔ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں اس کی مثال کم ہی مل سکتی ہے، حمیدیہ کالج بھوپال کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر گیان چند جین نے الہ آباد یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے لئے ایک تحقیقاتی مقالہ لکھا جس میں یہ بتایا کہ اردو نثر میں داستانوں کی جو کتابیں رائج ہیں۔ ان کا سرچشمہ اولین کون سا ہے وہ کن کن راستوں سے گذری ہیں اور اس وقت ان کی حالت کیا ہے۔ ان داستانوں میں "شرارِ عشق" جیسے چھوٹے چھوٹے قصوں سے لے کر الف لیلہ، داستان امیر حمزہ اور بوستانِ خیال تک کی ضخیم کتابیں سب شامل ہیں اور (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) ان میں سے ایک ایک کتاب کے متعلق اتنی کاوش سے کام لیا ہے کہ مصنف کی محنت کی داد دینی پڑتی ہے، جن حضرات کو لٹریچر کے اس صنف سے دلچسپی ہو، ان کے لئے یہ پر از معلومات کتاب بڑی مفید ثابت ہوگی۔ ضخامت چھ سو صفحات سے زیادہ۔ قیمت (بلا جلد) نو روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ۔ انجمن ترقی اردو پاکستان اردو روڈ کراچی، افسوس ہے کہ کتاب کی فہرست مرتب کرنے میں سہل انگاری سے کام لیا گیا ہے۔ اس کی فہرست بڑی تفصیلی ہونی چاہیئے تھی۔

جینے کا قرینہ

مصنف آندرا موروا۔ مترجم مختار صدیقی

ضخامت ۳۹۹ صفحے مجلد گرد پوش

قیمت چھ روپے۔ ناشر مکتبہ جدید لاہور

زیرِ نظر کتاب فرانسیسی مصنف آندرا موروا کی تصنیف ہے، جسے مختار صدیقی نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اس میں انسانی زندگی کی روزمرہ کی الجھنوں، آپس میں پیدا ہونے والے اختلافات اور غلط فہمیوں کو خوبصورتی کے ساتھ دور کرنے اور خوشگوار زندگی بسر کرنے کے طریقوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے

آندرے موروا فرانس کے نامور ادیب ہیں۔ ان کی تخلیقات ملک میں کافی مقبول ہیں۔ انھوں نے زیرِ نظر کتاب میں اپنے ادبی ڈگر سے ہٹ کر نفسیاتی موضوع پر قلم اٹھایا ہے، محبت، شادی

(باقی صفحہ ۱۶ پر)

حدیث اور سنت کی حیثیت

مرزائی صاحبان کے نزدیک

اور ہم اس کے جواب میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر بیان کرتے ہیں کہ میرے اس دعوے کی بنیاد حدیث نہیں بلکہ قرآن اور وحی ہے جو میرے پر نازل ہوئی ہاں تائید کے طور پر ہم وہ حدیثیں بھی پیش کرتے ہیں جو قرآن شریف کے مطابق ہیں اور میری وحی کے معارض نہیں اور دوسری حدیثوں کو ہم ردی کی طرح پھینک دیتے ہیں۔

(اعجاز احمدی ص۳۰ مصنف مرزا غلام احمد قادیانی صاحب)

اور جو شخص حکم ہو کر آیا ہے، اس کو اختیار ہے کہ حدیثوں کے ذخیرہ میں سے جس انبار کو چاہے خدا سے علم پاکر قبول کرے اور جس ڈھیر کو چاہے خدا سے علم پاکر رد کردے۔

(تحفہ گولڑویہ ص۱۰ مصنف مرزا غلام احمد قادیانی صاحب)

ایک شخص نے نہایت گستاخی اور بے ادبی سے لکھا ہے کہ احادیث جنہیں ہم اپنے محدود ناقص علم سے صحیح سمجھیں ان کے مقابلہ میں مسیح موعود کی وحی رہا وہ وحی جس کے بارے میں آپ فرماتے ہیں کہ یہ وحی دوسرے انبیاء علیہ السلام کی طرح شبہات سے پاک و منزہ ہے، رد کردینے کے قابل ہے۔ اس نادان نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ اس طرح تو اسے مسیح موعود (مرزا صاحب) کے دعاوی صادقہ سے بھی انکار کرنا پڑیگا کہ وہ احادیث جن سے آپ کا دعویٰ ثابت ہوتا ہے لا مہدی الا عیسیٰ ابن مریم، ود علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل، اور تنکسف القمر لاول لیلۃ من رمضان یہ سب محدثین کے نزدیک ضعیف ہیں۔ مگر خدا کے مامور نے جب اپنے دعوے کا صدق الہامات کے ذریعہ پیش گوئیوں اور دیگر نشانات سے ثابت کر دیا۔ تو پھر ہم نے آپ کو حکم وعدل مان لیا، اور جس حدیث کو آپ نے صحیح کہا وہ ہم نے صحیح سمجھی اور جسے آپ نے متشابہ قرار دیا، اسے ہم نے حکم کے تابع کرلیا اور جس حدیث کے بارے میں فرمایا یہ چھوڑ دینے کے قابل ہے وہ چھوڑ دی کیونکہ حدیث تو راویوں کے ذریعہ ہم تک پہنچی اور ہم کو معلوم نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا۔ مگر خدا کا زندہ رسول (مرزا صاحب) جو ہم میں موجود تھا، اس نے خدا سے یقینی علم پاکر امر حق پر اطلاع دی، اور جب وہ اتباع کامل نبوی سے نبی ہوا تو ہم نے مان لیا کہ آپ کے قول و فعل کے خلاف اگر کوئی حدیث بیان کی جائے تو ہم اسے قابل تاویل سمجھیں گے۔ اس لئے کہ جو باتیں ہم نے مسیح موعود سے سنیں۔ وہ اس راوی کی روایت سے زیادہ معتبر ہیں، جسے حدیث میں بتایا جاتا ہے

(اخبار الفضل قادیان جلد ۲ نمبر ۱۳۳۔ مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۱۵ء)

قرآن کریم اور الہامات مسیح موعود دونوں خدا تعالیٰ کے کلام ہیں، دونوں میں اختلاف ہو ہی نہیں سکتا، اس لئے مقدم رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حدیث تو بیسیوں راویوں کے پیچھے سے ہمیں ملی ہے۔ اور الہام براہ راست اس لئے (مرزا صاحب کا) الہام مقدم ہے۔ نہ اس لئے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے معتبر ہے بلکہ اس لئے کہ اس کے راوی اس کے راویوں سے معتبر ہیں، مسیح موعود سے جو باتیں ہم نے سنی ہیں وہ حدیث کی روایت سے معتبر ہیں کیونکہ حدیث ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے نہیں سنی، سچی حدیث اور مسیح موعود کا قول مخالف نہیں ہو سکتے۔

(میاں محمود احمد صاحب خلیفہ قادیان کا ارشاد۔ مندرجہ اخبار الفضل قادیان جلد ۲ مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۱۵ء)

چنانچہ حضرت مسیح موعود بڑی وضاحت سے فرماتے ہیں مولوی لوگ حدیثیں لئے پھرتے ہیں۔ مگر حدیثوں کا یہ کام نہیں کہ میرے متعلق فیصلہ کریں بلکہ میرا کام یہ ہے کہ میں بتاؤں کہ فلاں حدیث درست ہے اور فلاں غلط . . . . پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جب کوئی نبی آجائے تو پہلے نبی کا علم بھی اسی کے ذریعہ ملتا ہے۔ یوں اپنے طور پر نہیں مل سکتا۔ اور ہر بعد میں آنیوالا نبی پہلے نبی کے لئے بمنزلہ سوراخ کے ہوتا ہے۔ پہلے نبی کے آگے دیوار کھینچ دی جاتی ہے اور کچھ نظر نہیں آتا سوائے آنے والے نبی کے ذریعہ دیکھنے کے۔ یہی وجہ ہے کہ اب کوئی قرآن نہیں سوائے اس قرآن کے جو حضرت مسیح موعود نے پیش کیا۔ اور کوئی حدیث نہیں سوائے اس حدیث کے جو حضرت مسیح موعود کی روشنی میں نظر آئے اور کوئی نبی نہیں سوائے اس نبی کے جو حضرت مسیح موعود کی روشنی میں دکھائی دے اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود اسی ذریعہ سے نظر آئیگا کہ حضرت مسیح موعود کی روشنی میں دیکھا جائے۔ اگر کوئی چاہے کہ آپ سے علیحدہ ہو کر کچھ دیکھ سکے۔ تو اسے کچھ نظر نہ آئے گا۔ ایسی صورت میں اگر کوئی قرآن کو بھی دیکھے گا۔ تو وہ اس کے لئے "یہدی من یشاء" والا قرآن نہ ہوگا بلکہ "یضل من یشاء" والا قرآن ہوگا۔ اسی طرح اگر حدیثوں کو اپنے طور پر پڑھیں گے۔ تو وہ مداری کے پٹارے سے زیادہ وقعت نہ رکھیں گی۔ حضرت مسیح موعود فرمایا کرتے تھے۔ حدیثوں کی کتابوں کی مثال مداری کے پٹارے کی سی ہے، جس طرح مداری جو چاہتا ہے اس میں سے نکال لیتا ہے۔ اسی طرح ان سے جو چاہو نکال لو۔

(میاں محمود احمد صاحب خلیفہ قادیان کا خطبہ جمعہ مندرجہ اخبار الفضل قادیان جلد ۱۱ مورخہ ۱۵ جولائی ۱۹۲۴ء)

صحیح حدیثیں صرف وہ ہیں جو ان کے لئے مفید مطلب ہیں

اس امت میں نبی کا نام پانے کے لئے میں ہی مخصوص کیا گیا اور دوسرے تمام لوگ اس نام کے مستحق نہیں، اور ضرور تھا کہ ایسا ہوتا۔ جیسا کہ احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ ایسا شخص ایک ہی ہوگا وہ پیش گوئی پوری ہو جائے۔

(حقیقۃ الوحی ص۳۹۱ مصنف مرزا غلام احمد قادیانی صاحب)

اس امت میں نبی صرف ایک ہی آ سکتا ہے جو مسیح موعود ہے اور قطعاً کوئی نہیں آسکتا۔ جیسا کہ دیگر احادیث پر نظر کرنے سے یہ امر متحقق ہو چکا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف مسیح موعود کا نام نبی اللہ رکھا ہے۔ اور کسی کو یہ نام ہرگز نہیں دیا۔

(رسالہ تشحیذ الاذہان۔ قادیان جلد نمبر ۹ نمبر ۳ ص ۳۰ تا ۳۲ ماہ مارچ ۱۹۱۴ء)

پس یہ آیت "یا ایھا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما" کی رو سے اور ان احادیث کی رو سے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کی تاکید پائی جاتی ہے حضرت مسیح موعود (مرزا صاحب) علیہ الصلوٰۃ والسلام پر درود بھیجنا بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھیجنا از بس ضروری ہے

(رسالہ درود شریف مصنف محمد اسمٰعیل صاحب قادیانی ص۱۳۶)

از روئے سنت اسلام و احادیث نبویہ ضروری ہے کہ بالتصریح سے آپ کی آل کو بھی درود میں شامل کیا جائے۔ اسی طرح بلکہ اس سے بھی بدرجہا بڑھ کر یہ بات ضروری ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر بھی تصریح سے درود بھیجا جائے اور اس اجمالی درود پر اکتفا نہ کیا جائے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کے وقت آپ کو بھی پہونچ جاتا ہے۔

(رسالہ درود شریف بحوالہ اربعین نمبر ۲ ص۶ مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی صاحب)

نبوت کا دروازہ کھلا ہے

جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں صرف محدثیت ہی جاری نہیں۔ بلکہ اس سے اوپر نبوت کا سلسلہ جاری ہے، پس یہ بات بالکل روز روشن کی طرح ثابت ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ کھلا ہے اور جب کہ نبوت کا دروازہ علاوہ محدثیت کے امت محمدیؐ میں کھلا ثابت ہوگیا۔ تو یہ بھی ثابت ہو گیا کہ مسیح موعود بھی نبی اللہ تھے۔

حقیقۃ النبوۃ ص۲۲۸-۲۲۹ مصنف میاں محمود احمد خلیفہ قادیان)

حقیقی نبی

پس شریعت اسلامی نبی کے جو معنی کرتی ہے۔ اس کے معنی سے حضرت (مرزا صاحب) ہرگز مجازی نبی نہیں ہیں بلکہ حقیقی نبی ہیں۔

حقیقۃ النبوۃ ص۱۷۴ مصنف میاں محمود احمد خلیفہ قادیان)

حضرت مسیح موعود (مرزا صاحب) نے اپنے آپ کو کھلے طور پر نبی اللہ اور رسول اللہ پیش کیا ہے، اور اپنے آپ کو زمرۂ انبیاء

درمرسلین میں شامل فرمایا ہے۔ اور جن آیات قرآنیہ کو اپنے دعوے میں پیش کیا ہے ان میں صریح طور سے الفاظ رسول یا مرسل کے موجود ہیں۔ جن کا حضور (مرزا صاحب) نے اپنے آپ کو مصداق ٹھہرایا ہے۔ پس آیات قرآنیہ جن کے لفظ رسول کا اپنے آپ کو مصداق ٹھہرانا صاف اور صریح اس امر کی بیّن دلیل ہے کہ حضرت مسیح موعود من حیثیت النبوۃ ان ہی معنوں میں نبی اللہ اور رسول اللہ تھے۔ جن معنوں میں ان آیات سے دیگر انبیاء یقین مراد لیے جاتے ہیں۔

(اخبار الفضل قادیان جلد ۲ نمبر ۳۸ مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۱۴ء)

نبی کس لئے آتے ہیں ؟

نیا دین لانے انبیاء اس لئے آتے ہیں تاکہ ایک دین سے دوسرے دین میں داخل کریں۔ اور ایک قبلہ سے دوسرا قبلہ مقرر کرادیں اور بعض احکام کو منسوخ کریں اور بعض نئے احکام لادیں

(مکتوبات احمدیہ جلد پنجم نمبر چہارم ص۳۳ مجموعہ مکتوبات مرزا غلام احمد قادیانی صاحب)

اب اتباع کس کی سنت کی ہوگی

سوال :۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام (مرزا صاحب) کے بعد بھی جب نبی آنے کا امکان ہے۔ تو آپ کو آخری زمانہ کا نبی کہنے کا کیا مطلب ہے ؟

جواب :۔ آخری زمانہ کا نبی اصطلاح ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے توسطے کے بغیر کسی کو نبوت کا درجہ حاصل نہیں ہوسکتا اب کوئی ایسا نبی نہیں آسکتا۔ جو بیچ کے کر رسول کریمؐ سے براہ راست تعلق پیدا کرکے نبی بن سکا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ میری اتباع کے بغیر کسی کو قرب الٰہی حاصل نہیں ہوسکتا پس آئندہ خواہ کوئی نبی ہو۔ اس کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لانا ضروری ہے۔

(ارشاد میاں محمود احمد صاحب خلیفہ قادیان مندرجہ اخبار الفضل قادیان نمبر ۱۳۰ جلد ۲۰ مورخہ ۲ مئی ۱۹۳۳ء)

اے مسلمان کہلانے والو ! اگر تم واقعی اسلام کا بول بالا چاہتے اور باقی دنیا کو اپنی طرف بلاتے ہو تو پہلے خود سچے اسلام کی طرف آؤ جو مسیح موعود (مرزا غلام احمد قادیانی صاحب) میں ہو کر ملتا ہے۔ اسی کے طفیل آج بِرّ و تقویٰ کی راہیں کھلتی ہیں۔ اس کی پیروی سے انسان فلاح و نجات کی منزلِ مقصود تک پہونچ سکتا ہے وہ وہی فخر اولین اور آخرین ہے جو آج سے تیرہ سو برس پہلے رحمۃ اللعالمین بن کر آیا تھا۔ اور اب اپنی تکمیل تبلیغ کے ذریعہ ثابت کر گیا کہ واقعی اس کی دعوت جمیع ممالک و ملل عالم کے لئے تھی۔ فصلی اللہ علیہ وسلم۔

(اخبار الفضل قادیان جلد ۳ نمبر ۴۱ مورخہ ۲۶ ستمبر ۱۹۱۵ء)

[یہ ہے مرزا صاحب اور ان کے متبعین کے نزدیک احادیث نبویؐ اور اتباع سنت رسول اللہؐ کی حیثیت، خدا کی شان کہ یہ لوگ بھی طلوع اسلام کو "منکرِ حدیث" اور "منکرِ سنت" قرار دے کر مطعون کرتے ہیں۔ (طلوع اسلام)]

مطبوعات طلوع اسلام

معراج انسانیت — از پرویز۔ سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرورِ کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے تقریباً نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ مضبوط و حسین جلد معہ گرد پوش۔ قیمت بیس روپے

ابلیس و آدم — (از پرویز) سلسلہ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق۔ قصۂ آدم۔ ابلیس۔ جنات۔ ملائکہ۔ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۳۷۶ صفحات۔ قیمت آٹھ روپے

قرآنی دستور پاکستان — اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے اور حکومت۔ علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ ۲۴۴ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام — اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۲۰۸ صفحات قیمت دو روپے

سلیم کے نام — از پرویز۔ نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوئے ہیں ان کا شگفتہ مدلل اور اچھوتا جواب۔ بڑے سائز کے ۲۲۵ صفحات۔ قیمت چھ روپے

قرآنی فیصلے — روزمرہ کی زندگی کے ساٹھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث۔ ۴۰۸ صفحات۔ قیمت چار روپے

اسباب زوال امت — از پرویز۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا؟ ۱۵۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے — ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ سات سالہ دور آزادی کی منہ بولتی تاریخ۔ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

مزاج شناس رسول — یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناس رسول! مزاج شناس کون ہیں۔ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۴۴۰ صفحات۔ قیمت چار روپے

مقام حدیث — حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں۔ ہر جلد کے تقریباً چار سو صفحات اور قیمت فی جلد چار روپے

فردوس گم گشتہ — از پرویز۔ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے۔ اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف چار سو سولہ صفحات۔ قیمت چھ روپے۔

نوادرات — از علامہ اسلم جیراجپوری۔ علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ ۴۰۰ صفحات۔ قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت — (از پرویز) مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ بکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں۔ صفحات ۱۹۲ قیمت دو روپے

نوٹ :۔ تمام کتابیں مجلد ہیں اور گرد پوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ ادارۂ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۴۳۔ کراچی

حقائق وعبر

تکلف برطرف

۲ر اپریل کے طلوع اسلام میں ہم نے ایک مضمون "قرآن اور حدیث کی صحیح پوزیشن" کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ جیسا کہ ہم نے نوٹ میں واضح کر دیا تھا۔ وہ مضمون مولانا مودودی کی تحریروں سے اس طرح مرتب کیا گیا تھا کہ تمام الفاظ انہی کے تھے۔ ہم نے جن جن اقتباسات کو نقل کیا ان کے حوالے بھی دیدیئے تھے اور یہ لکھ دیا تھا کہ قارئین حوالے دیکھ کر اپنا اطمینان خود کر لیں کہ اقتباسات سیاق وسباق کے مطابق ہیں۔ یا توڑ موڑ کر لکھے گئے ہیں، ہم نے یہ بھی لکھ دیا تھا کہ ان اقتباسات کو یکجا کرنے سے جو مسلک سامنے آتا ہے بعینہٖ وہی طلوع اسلام کا ہے لیکن اس کے باوجود طلوع اسلام کو منکر حدیث اور کیا کیا کچھ کہہ دیا جاتا ہے اور جماعت اسلامی اور اس کے امیر سب سے بڑے حامی حدیث اور متبع سنت بنتے ہیں۔

اس پر معاصر "تسنیم" بہت چراغ پا ہوا ہے، اس نے یہ نہیں بتایا کہ اقتباسات غلط ہیں یا انہیں سیاق وسباق سے توڑ موڑ کر لکھا گیا ہے، بلکہ اس نے یہ خدشہ ظاہر کیا ہے کہ اگر کوئی شخص نیچے حاشیے میں حوالے نہ دیکھے تو وہ یہ بھی نہیں جان سکتا کہ ان نقروں کا حسب ونسب کیا ہے؛ یعنی اعتراض ملاحظہ فرمایئے کہ اگر کوئی شخص ان حوالوں کو نہ دیکھے جو خود طلوع اسلام نے دیدیئے ہیں تو وہ یہ نہ کہہ سکے گا کہ اقتباسات کہاں سے لئے گئے ہیں انہیں کون بتائے کہ حوالے دیئے ہی اس لئے جاتے ہیں کہ ان سے مضمون کا ماخذ معلوم ہو سکے اور اگر کوئی شخص حوالوں کو نہ دیکھے تو حیثیت آفتاب را چہ گناہ۔ لیکن یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی، اس کے بعد ارشاد ہے:۔

تفسیر کا ایک مشہور اصول تفسیر قرآن بالقرآن ہے یعنی اگر قرآن کی کسی آیت کا مطلب سمجھنا ہو تو سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا خود قرآن میں کسی دوسرے مقام پر کوئی آیت اس کی تشریح کرتی ہے؟ اگر قرآن ہی سے کسی آیت کی تشریح ہو جائے تو یہ تشریح سب سے معتبر اور مستند سمجھی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی نظام ربوبیت کے مدعیوں نے جو قرآن کے بغیر نوالہ نہیں توڑتے مولانا مودودی کے معاملہ میں بھی یہی اصول اختیار کیا ہے، اور ان کے کلام کی تفسیر انہی کے کلام سے کی ہے۔

انداز تحریر سے مترشح ہوتا ہے کہ انہیں اس اصول پر تو اعتراض نہیں کہ قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے۔ البتہ اعتراض اس پر ہے کہ مولانا مودودی کے کلام کی تفسیر انہی کے کلام سے کیوں کی جائے؟ گویا مودودی صاحب کے کلام کی تفسیر ان کے کلام میں تلاش نہیں کرنی چاہیئے۔ بلکہ کہیں اور ڈھونڈھنی چاہیئے، کیا "تسنیم" ہمیں بتائے گا کہ وہ "مثلاً معہ" کیا ہے جس سے مودودی صاحب کے کلام کی تفسیر ہو سکتی ہے اور وہ کہاں سے دستیاب ہوتی ہے؟

تکلف برطرف ہم حامیین جماعت اسلامی سے باادب پوچھتے ہیں کہ اگر مودودی صاحب کے مفہوم ومعانی کو ان کے کلام میں نہ ڈھونڈنا جائے تو اور کہاں دیکھا جائے۔ نیز ہم نے اقتباسات کو ترتیب دے کر جو معانی پیدا کئے ہیں، اگر وہ غلط ہے، تو ہمیں بتایئے کہ قرآن اور حدیث کی صحیح پوزیشن کے بارے میں مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کا نظریہ کیا ہے؟ اگر مودودی صاحب کا کوئی مربوط مضمون ایسا ہے جس سے اس باب میں ان کا مسلک بیک جا واضح ہو جاتا ہے، تو اس کی نشان دہی کر دیجئے تاکہ ہم اسے دیکھ سکیں، اگر مودودی صاحب کے علاوہ کسی اور صاحب نے کہیں اور یہ پوزیشن واضح کی ہے۔ تو از راہ کرم وہ ہمیں بتا دیجئے، تاکہ معاملہ صاف ہو جائے، لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہ حضرات کبھی متعین طور پر نہیں بتائیں گے (نہ مودودی صاحب نہ ان کے متبعین) کہ ان کے نزدیک حدیث وسنت کی پوزیشن کیا ہے، ان کی ٹکنیک یہ ہے کہ کسی ایک جگہ بات واضح اور متعین طور پر نہ کہی جائے، ہر بات مبہم رکھئے اور ہر جگہ متضاد بات کہیئے، تاکہ اس مداری کے پٹارے سے جس وقت جی چاہے حسب منشا مبات نکال لی جائے۔

ہم جماعت اسلامی کے ذمہ دار حضرات سے پھر درخواست کرتے ہیں کہ وہ حدیث اور سنت کے بارے میں اپنا اور مودودی صاحب کا متعین مسلک بتائیں۔ تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ منکر حدیث کون ہے۔

سنت رسول اللہ

۲ر اپریل کے طلوع اسلام میں عنوان بالا کے تحت لمعات میں یہ بتایا گیا تھا کہ ہمارے نزدیک اتباع سنت کی صحیح پوزیشن کیا ہے ہم نے اس کے ساتھ ہی پاکستان کے مختلف افراد اور اداروں سے بالعموم اور جماعت اسلامی سے بالخصوص یہ درخواست کی تھی کہ وہ ہمیں بتائے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں کوئی غلطی ہے اور ہے تو کہاں؟ اس مقالہ کی اشاعت کے بعد ہم نے نعیم صدیقی اور امین احسن اصلاحی صاحبان کی خدمت میں خطوط لکھ کر ان کی توجہ اس درخواست کی طرف مبذول کرائی، اس وقت تک نہ ان کی طرف سے (نہ کسی اور طرف سے) ہمیں کوئی جواب موصول ہوا ہے ہمیں توقع ہے کہ وہ ہماری درخواست پر ضرور غور کریں گے۔ (طلوع اسلام)

نقد ونظر (ص۱۵ سے آگے)

گرہست، دوستی، غور وفکر، کام، قیادت، بڑھاپا اور مسرت کے عنوانوں پر دلچسپ بحث کی ہے، ان کی بحث کا انداز عام فہم اور دلنشین ہے، گو ہر باب اپنی جگہ پر مکمل ہے لیکن پوری کتاب میں ربط اور تسلسل بھی موجود ہے۔ عوام اور خواص ہر طبقے کو اس کتاب میں ان کی دلچسپی اور ان کے ذوق کی تسکین کا کچھ نہ کچھ سامان ضرور مل جائے گا۔ ترجمہ رواں اور شگفتہ ہے، جب ہم اس قسم کی کتابوں کو دیکھتے ہیں تو بے اختیار ہمارے لب تاسف آگین ہو جاتے ہیں کہ اگر ان لوگوں کے سامنے وحی کی روشنی ہوتی۔ تو جس زندگی کی تلاش میں یہ اس قدر مضطرب وبیقرار رہتے ہیں۔ وہ کس طرح از خود بے نقاب ہو کر ان کے سامنے آجاتی۔ لیکن وحی کی روشنی ان تک کیسے پہنچے جب وحی کے وارثین کی اپنی زندگی اس قدر تلخ اور ناکام ہے کہ وہ اپنی راہ نمائی کے لئے ان لوگوں کی دریوزہ گری کرنے پر مجبور ہو رہی ہے۔

پیشگی خریدار

پیشگی خریداروں کی تجویز کے سلسلہ میں عام طور پر یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ماہانہ قسطیں پچیس روپے کی نہ ہوں بلکہ کم کی ہوں، چنانچہ قارئین کی سہولت کے لئے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ایک سو روپے کی پیشگی رقم دس روپے کی ماہانہ قسطوں میں بھی ادا کی جا سکتی ہے، جو اصحاب اس سے زیادہ کی ماہانہ قسط دینا چاہیں وہ حسب منشاء ایسا کر سکتے ہیں۔

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

طلوع اسلام کا دفتر

۲۳/۱ فاؤلرز لائن۔ نیپیئر بارکس میں واقع ہے

صدر کی طرف سے آنے والے حضرات نیپیر بارکس میں داخل ہو کر بجائے سیدھے جناح اسپتال کی طرف جانے کے بائیں ہاتھ ڈرگ روڈ کی طرف مڑ جائیں تو تھوڑے فاصلہ پر بائیں ہاتھ کو پی، ڈبلیو، ڈی کے انکوائری آفس کے عقب میں طلوع اسلام کا دفتر ہے۔

اسی دفتر میں

ہر اتوار کو صبح ۹ بجے

محترم پرویز صاحب قرآن پر لیکچر دیتے ہیں۔

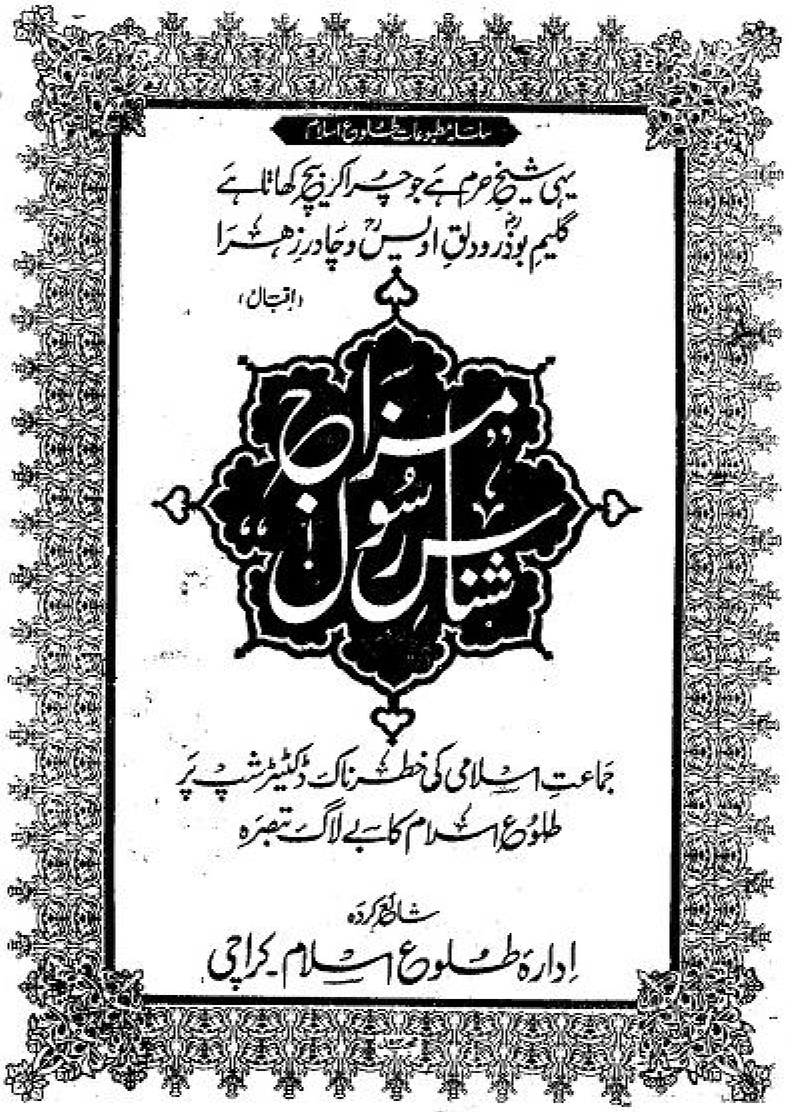

ضخامت ۴۴۸ صفحات ۔ مجلد مع گرد پوش ۔
قیمت ۴/- روپے علاوہ محصول ڈاک

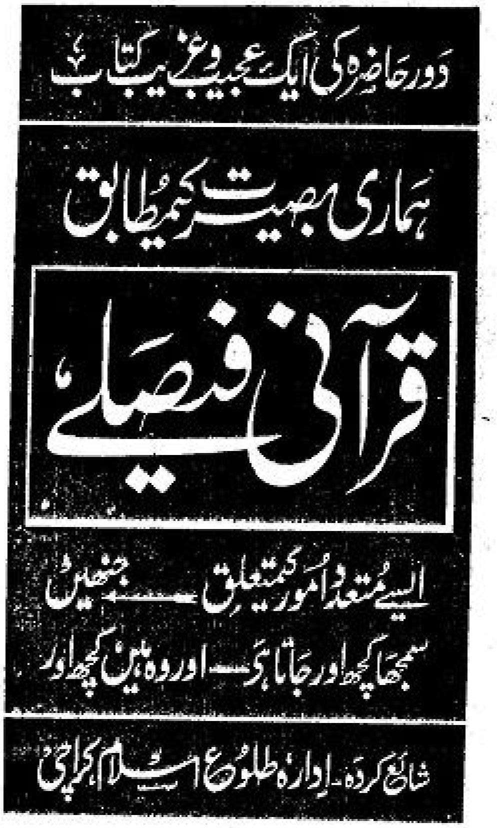

ضخامت ۴۰۸ صفحات مجلد مع گردپوش
قیمت ۴/ روپے علاوہ محصول ڈاک

قیمت ۱/۸/- روپیہ

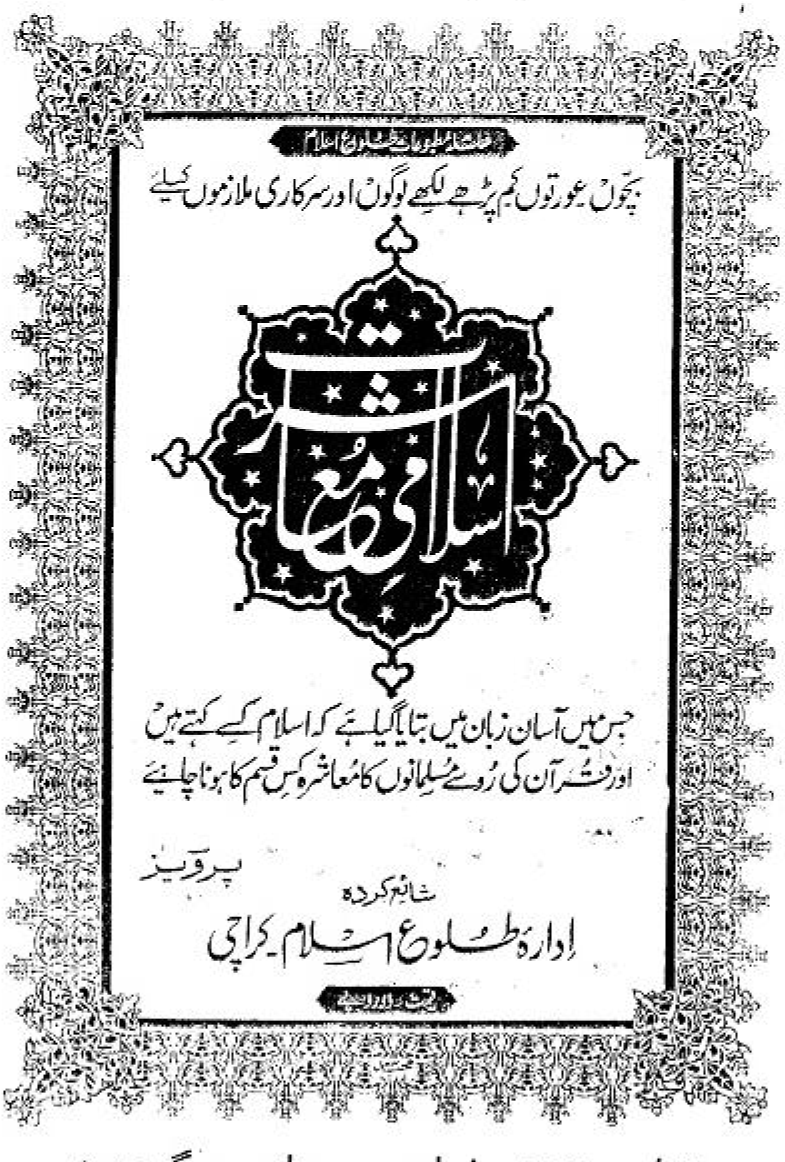

ضخامت ۱۹۲ صفحات مجلد مع گرد پوش
قیمت ۲/- روپے علاوہ محصول ڈاک

قیمت ۲/- روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۳۱۳ ۔ کراچی

فردوسِ گم گشتہ

دورِ حاضرہ کے نوجوان طبقے کے دلوں میں جس عقابی روح کی بیداری کے
آثار دکھائی دے رہے ہیں۔ اس کے بال و پر کی بالیدگی میں
"مفسرِ قرآن" و "ترجمانِ اقبال" جناب پرویز
کے فکرِ عمیق اور اسلوبِ بلیغ کا حصہ نمایاں ہے۔
"فردوسِ گم گشتہ" اسی صاحبِ نظر کے فکر و اسلوب کا دلکش مجموعہ ہے
جو ملت کی متاعِ گم شدہ کی بازیابی کی راہ بتاتا ہے۔ اور ہر حساس
قلب کو جس میں تخلیقِ نو کی آرزو موجزن ہے، پکار پکار کر کہتا ہے کہ

صورت گری را از من بیاموز
شاید کہ خود را باز آفرینی

ضخامت ۴۱۲ صفحات مجلد مع گرد پوش قیمت -/۶
علاوہ محصول ڈاک

Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound, Bunder Road, Karachi. Text at Adabi Press, Robson Road, Karachi.